مطالعہ علوم اسلامیہ
اردو ترجمہ
كتاب السرقة والسير
من الهداية
تصدرها:
المكتبة العلمية
١٥- ليك روڈ، لاہور
للطباعة والنشر والتوزيع
مغربی پاکستان

مطالعۂ علومِ اسلامیّہ

اردو ترجمہ

کتاب السرقۃ والسیر

من "الھدایۃ"

پروفیسر غازی احمد

منشی فاضل ۔ فاضل درس نظامی
مولوی فاضل (میڈلسٹ)
ایم ۔ او ۔ ایل ، بی ۔ ایڈ
ایم ۔ اے (علوم اسلامیہ گولڈ میڈلسٹ)
ایم ۔ اے (عربی ، گولڈ میڈلسٹ)

۱۵۔شارع مدرسۃ البنات ، لاہور

پاکستان

حقوق محفوظة للناشر

الناشر : خان عبد الحق الندوى

الثمن -/٣٠

طبع في مطبعة المكتبة العلمية ١٥ - شارع ستر البنات - لاهور

فہرست مضامین

(کتاب السرقة والسیر)

—:o:—

كِتَابُ السَّرِقَةِ

چوری کے احکام کا بیان

سرقہ لغۃ میں کسی دوسرے کی چیز کو اس سے خفیہ اور پوشیدہ طور پر لے لینے کو کہا جاتا ہے اور اسی سے استراق السمع ماخوذ ہے۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ (الحجر:۱۸) یعنی اِلّا یہ کہ کچھ (چوری چھپے) سن گن لے۔ اور شرعی لحاظ سے کچھ اوصاف کا ان لغوی معنوں پر اضافہ کیا گیا ہے۔ ان کا بیان إن شاء اللہ عنقریب آ رہا ہے۔ لغوی معنی ابتداء اور انتہاء دونوں میں ملحوظ رکھا گیا ہے یا صرف ابتداء ہی میں اس معنی کا اعتبار کیا گیا ہے۔ جیسا کہ خفیہ طور پر کسی دیوار میں نقب لگائی اور اندر داخل ہو کر مالک کے ساتھ کھلم کھلا لڑائی کرکے مال چھین لیا۔ اور سرقہ کبری یعنی رہزنی میں امام کی آنکھ سے چوری ہے۔ کیونکہ امام ہی اپنے سپاہیوں کے ساتھ راستوں کی حفاظت کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اور سرقہ صغری میں مالک یا اس کے قائم مقام کی آنکھ سے چوری ہے۔

مسئلہ: اگر کسی عاقل و بالغ شخص نے دس

درہم یا ایسی چیز جس کی قیمت دس درہم کے سکوں تک پہنچ جاتی ہے، ایسے محفوظ مقام سے چرائے جس میں کوئی شبہ نہیں تو اس کا ہاتھ کاٹ دینا واجب ہوگا اور اس بارے میں اللہ تعالی کا یہ ارشاد اصل کی حیثیت رکھتا ہے: وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا أَيْدِيَهُمَا (المائدۃ : ۳۸) اور چور خواہ مرد ہو یا عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ دو۔

عقل اور بلوغ کے اعتبار کرنے کے بغیر چارۂ کار نہیں، کیونکہ عقل اور بلوغ کے سوا جرم کا تحقق نہیں ہو سکتا۔ اور قطع ید جرم ہی کی جزاء ہے۔ [درہم تقریباً ساڑھے تین ماشے چاندی کے برابر ہوتا ہے اور دینار ساڑھے چار ماشے سونے کے برابر ہوتا ہے]۔ مال کثیر کی حد کا تعین بھی ضروری ہے کیونکہ حقیر مال کو چرانے کی خواہش کم ہی ہوتی ہے۔ اس طرح حقیر مال کو لینے والا کوئی اخفاء بھی نہیں کرتا (بلکہ ایسا مال عموماً لوگوں کے سامنے بھی اٹھا لیا جاتا ہے) تو سرقہ کا رکن متحقق نہ ہوگا اور نہ زجر و تنبیہ کا کوئی ثمرہ مرتب ہوگا۔ کیونکہ حکمتِ زجر ایسی صورت میں ممکن ہے جو غالب واقع ہو۔

دس درہم مقدار مقرر کرنا ہمارا مسلک ہے۔ امام شافعیؒ نے ربع دینار مقرر فرمایا ہے اور امام مالکؒ کے نزدیک تین درہم ہیں۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کی دلیل یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے عہد مبارک میں قطع ید اسی صورت میں ہوتا تھا جب کہ مال کی قیمت چرمی ڈھال کے برابر

ہوتی ، اور ڈھال کی قیمت کے بارے میں کم از کم اندازہ
تین درہم ہے ۔ اور کم از کم قیمت کو لینا اولی ہے ۔ کیونکہ
یہ یقینی امر ہے ۔ البتہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ عہد
نبوی میں دینار کے بارہ درہم ہوا کرتے تھے اور تین درہم
چوتھائی دینار کے برابر ہوں گے ۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ چوری کے سلسلے میں زیادہ سے زیادہ
مقدار کو لینا مناسب ہے تا کہ حد کے ازالے کی کوئی صورت پیدا
ہو سکے ۔ کیونکہ کمتر مقدار میں یہ شبہ بھی ہو سکتا ہے
کہ شاید یہ قابل سزا جرم نہ ہو اور شبہ ایسی چیز ہے جس
سے حد کا ازالہ ہو جاتا ہے ۔ اور اس کی تائید نبی اکرم ﷺ
کے اس ارشاد گرامی سے بھی ہوتی ہے کہ قطع ید ایک دینار
یا دس درہموں میں ہوگا ۔ اور عرف میں درہم کا اطلاق اسی
پر ہوتا ہے جو بطور سکہ مروّج ہو نیز اس سے پتا چلا کہ
درہم کا مضروب یعنی سکہ دار ہونا مشروط ہے ۔ جیسا کہ
کتاب یعنی قدوری میں مذکور ہے ، اور یہی ظاہر الروایۃ ہے
اور یہی صحیح بھی ہے ، تا کہ کامل جرم کی رعایت ہو ۔ حتی
کہ اگر چاندی کے دس ٹکڑے چرائے جن کی قیمت دس درہم
سکہ دار سے کم ہو تو قطع ید واجب نہ ہوگا ۔ پھر درہم
میں سات مثقال کے وزن کا اعتبار ہوگا ۔ کیونکہ عام علاقوں
میں یہی متعارف ہے ۔

صاحب قدوریؒ کا یہ کہنا : یا اس کی قیمت دس درہم
تک پہنچ جاتی ہو ۔ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اگر دراہم

کے علاوہ کوئی چیز ہو تو اس کی قیمت کا اندازہ دراہم سے لگایا جائے گا، خواہ سونا ہی کیوں نہ ہو۔ نیز محفوظ مکان سے چرانا جس میں کوئی شبہ نہ ہو بھی ضروری ہے۔ کیونکہ شبہ حد کو زائل کر دیتا ہے۔ ہم آیندہ اوراق میں إن شاء الله اس کی تفصیل بیان کریں گے۔

مسئلہ: آزاد اور غلام قطع ید کی سزا کے لحاظ سے برابر ہیں۔ کیونکہ نص میں کوئی تفصیل نہیں ہے (کہ چور غلام ہو یا آزاد بلکہ نص مطلق ہے)۔ نیز قطع ید کی صورت میں تنصیف بھی ممکن نہیں، لہذا لوگوں کے اموال کے بچاؤ کی خاطر سزا کامل ہوگی۔

مسئلہ: چور کے ایک بار اقرار کرنے پر قطع واجب ہو جائے گا۔ یہ امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کی رائے ہے۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ قطع ید کے لیے دوبار اقرار کرنا ضروری ہوگا۔ امام ابو یوسفؒ سے یہ بھی مروی ہے کہ دونوں اقرار مختلف مجالس میں ہوں۔ کیونکہ ثبوت کی دو دلیلوں (گواہی اور اقرار) میں سے اقرار بھی ایک دلیل ہے۔ تو اسے گواہی پر قیاس کیا جائے گا (اور چوری کے ثبوت کے لیے دو گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے)، اسی طرح ہم نے حد زناء میں بھی اعتبار کیا تھا (کہ ثبوت زناء کے لیے چونکہ چار گواہ شرط ہیں لہذا اقرار میں بھی چار بار کی شرط رکھی گئی)۔

امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ چوری کا

اظہار ایک بار اقرار کرلینے سے ہو جاتا ہے تو اسی پر اکتفاء کیا جائے گا۔ جیسا کہ قصاص اور حد قذف میں ہوتا ہے (کہ ایک بار کا اقرار ہی ثبوت کے لیے کافی ہوتا ہے)۔ اور شہادۃ پر اقرار کا قیاس کرنا درست نہیں ہے۔ کیونکہ شہادۃ میں ایک سے زیادہ گواہ ہونے کا یہ فائدہ ہے کہ کذب کی تہمت کم ہو جاتی ہے اور اقرار میں ایسا کوئی مفاد مد نظر نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس میں تہمت کی صورت نہیں ہوتی اور حد کے سقوط کے لیے اقرار سے رجوع کر لینا متعدد بار اقرار کے باوجود ممنوع نہیں (یعنی مثلاً اگر پانچ بار اقرار کرے لیکن اپنے اقرار سے رجوع کرلے تو حد ساقط ہو جائے گی۔ متعدد اقرار حد کے ازالے کو روک نہیں سکتے)۔ اور مال کے حق میں رجوع کرلینا قطعاً صحیح نہیں ہوتا۔ کیونکہ صاحب مال اس کی تکذیب کرنے کے لیے موجود ہے اور زناء کے سلسلے میں اقرار کا چار بار ہونا خلاف قیاس ہے تو اسے مورد شرع تک ہی محدود رکھا جائے گا (اور اس پر کسی دوسرے اس کو قیاس نہ کیا جا سکے گا)۔

مسئلہ : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ قطع ید دو گواہوں کی شہادۃ سے واجب ہوگا۔ کیونکہ ایسی شہادۃ سے چوری کا جرم ظاہر ہو جاتا ہے۔ جیسے دیگر حقوق میں ہوتا ہے اور مناسب یہ ہے کہ امام کیفیۃ سرقہ ماہیۃ سرقہ، وقت سرقہ اور مکان سرقہ کے بارے میں گواہوں سے سؤال کرے۔ تاکہ پوری پوری احتیاط سے کام لیا جائے

اس کی تفصیل حدود میں گزر چکی ہے اور چوری کی تہمت کی بناء پر قید میں رکھے ۔ حتی کہ گواہوں کے حالات سے پوری پوری واقفیت ہو جائے ۔

مسئلہ : امام قدوری نے فرمایا کہ جب فعل سرقہ میں ایک گروہ شامل ہو اور ہر ایک کے حصے میں دس دس درہم آگئے ہوں تو ہر ایک کا ہاتھ کاٹا جائے گا ۔ اگر حصہ دس درہم سے کم ہو تو قطع ید واجب نہ ہوگا ۔ کیونکہ قطع ید کا نصاب ہی موجب حد ہوتا ہے اور یہ سزا ہر ایک پر اس کے جرم کی بناء پر واجب ہوگی ۔ لہذا ہر ایک کے حق میں (دس درہم) نصاب کا کامل ہونا ضروری ہوگا ۔

بَابٌ مَا يُقْطَعُ فِيهِ وَمَا لَا يُقْطَعُ

جن اشیاء کے لیے ہاتھ کٹتا ہے اور جن کے لیے ہاتھ نہیں کٹتا

مسئلہ : جو چیز دارالاسلام میں مباح طور پر پائی جاتی ہو اور معمولی قسم کی چیز ہو اس میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ مثلاً (جلانے والی) لکڑی، گھاس، سرکنڈے، مچھلی، پرندہ، شکار (کے جانور)، ہڑتال، گیرو اور چونا وغیرہ۔ اس بارے میں حضرت عائشہؓ کی روایت اصل کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ عہد نبوی میں حقیر اشیاء کے چرانے پر ہاتھ نہیں کاٹا جاتا تھا اور جس چیز کی جنس اپنی اصل صورت پر مباح پائی جاتی ہو اور لوگوں میں اس کی کوئی خاص رغبت نہ ہو تو وہ حقیر چیز ہے۔ کیونکہ اس میں رغبت کم ہوتی ہے اور انسانی طبع ایسی اشیاء میں بخل سے کام نہیں لیتی اور ایسی صورت شاذ و نادر ہی پیش آتی ہے، کہ ایسی حقیر شے مالک کی ناگواری کے باوجود بھی لی جائے۔ (بلکہ اگر مالک کی رضاء نہ ہو تو لوگ ایسی حقیر چیز لینے کو تیار نہیں ہوتے)، تو ایسی چیزوں کے لیے زجر و توبیخ

کے لیے کسی حد کے مقرر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس لیے مقررہ نصاب سے کم چیز کے چرانے میں قطع ید نہیں ہوتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ ایسی حقیر چیزوں کی حفاظت کا بھی کوئی خاص اہتمام نہیں کیا جاتا۔ کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ لوگ عموماً جلانے کی لکڑیاں دروازے کے باہر ڈال دیتے ہیں اور گھر میں تو تعمیر کے سلسلے کے لیے جاتے ہیں حفاظت کے لیے نہیں۔ (یہ اس زمانے کی بات ہے جب آبادی کم تھی اور ہر شے ارزاں تھی۔ مگر آج کل تو ایندھن کی لکڑی کی قیمت بھی آسمان کو چھو رہی ہے اور عمارتی لکڑی تو قیمت کے لحاظ سے کہیں سے کہیں جا پہنچی ہے۔ البتہ مصنفؒ کے زمانے میں لکڑی حقیر چیز تھی آج کل تو عزیز شے میں داخل ہے)۔

پرندہ اڑ جاتا ہے اور شکاری جانور بھاگ جاتا ہے (لہذا زجر کے لیے حد مقرر کرنے کی ضرورت نہیں)۔ دوسری بات یہ ہے کہ شکار وغیرہ میں سب کی شراکت ہے (جو پکڑے یا شکار کرلے اسی کا ہوگا) تو ہر ایک کے ایسے مباح ہونے کا شبہ پیدا ہوگیا، اور حدود شبہ کی بناء پر ساقط ہو جایا کرتی ہیں۔

مچھلی میں خشک نمکین مچھلی اور تر مچھلی دونوں شامل ہیں اور پرندے میں مرغی، بطخ اور کبوتر بھی شامل ہیں۔ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے (کہ پرندہ اڑ کر اپنی

جان بچا سکتا ہے). نیز حضور ﷺ کا ارشاد : لَاقَطْعَ فِي الطَّيْرِ، مطلق ہے (جس میں أھلی یا غیر أھلی پرند کی کوئی قید نہیں) .

امام ابو یوسف کے قول کے مطابق گیلی مٹی ، خشک مٹی اور گوبر کے سوا تمام مذکورہ اشیاء چرانے میں سزا ہوگی اور امام شافعی کا بھی یہی قول ہے اور ان پر حدیث عائشہ حجة ہے . (موجودہ دور کے مد نظر امام ابو یوسف اور امام شافعی کا قول زیادہ قابل قبول ہے . مصنف کے زمانے میں تو شاید ایک دو آنے کی مرغی ملتی ہو . مگر آج کل بیس تیس روپے بلکہ اس سے بھی زیادہ قیمت کی مرغیاں ہیں . بلکہ آج کل تو گوبر بھی مفت نہیں ملتا اپلوں کی قیمت بھی کم نہیں) .

مسئلہ : امام قدوری نے فرمایا کہ جن اشیاء کے جلد خراب ہونے کا امکان ہوتا ہے ان میں قطع ید واجب نہیں ہوتا . جیسے دودھ ، گوشت اور تازہ پھل . حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ ثمر یا کثر میں قطع نہیں ہے . کثر سے مراد کھجور کی گوند ہے جو چربی کی طرح ہوتی ہے نیز حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ طعام میں قطع نہیں ہے . واللہ أعلم ، شاید طعام سے مراد وہ چیز ہے جو کھانے کے لیے تیار ہو اور جس کے جلد خراب ہو جانے کا اندیشہ ہو ، جیسے گوشت اور مچھلی وغیرہ ورنہ گندم اور چینی چرانے کی صورت میں بالاتفاق قطع ید ہوتا ہے .

امام شافعی فرماتے ہیں کہ مذکورہ اشیاء میں ہاتھ کاٹا جائے گا . کیونکہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ثمر

اور کثر میں قطع نہیں ۔ لیکن جب کھلیان ان کو پناہ دے دے (یعنی جب انہیں کھلیان میں اکھٹا کر دیا جائے) تو اس صورت میں قطع ید ہوگا ۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ استثناء بطور عادت ہے اور جو پھل جرین میں بھرے جاتے تھے (یعنی کھلیان میں اکھٹے کیے جاتے تھے) وہ اہل عرب کی عادت کے مطابق خشک پھل ہوتے تھے اور خشک پھلوں کی چوری کرنے میں قطع ید کے ہم بھی قائل ہیں ۔

مسئلہ : امام قدوری ؒ نے فرمایا : جو پھل درخت کے ساتھ لگے ہوئے ہوں یا جو فصل کٹی نہ گئی ہو ، اس کی چوری میں قطع ید نہ ہوگا ، کیونکہ ان کی حفاظت کا کوئی خاص اہتمام نہیں ہوتا ۔

مسئلہ : اور نشہ آور شربتوں میں قطع ید نہیں کیونکہ انہیں چرانے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے تو انہیں بہا دینے کے لیے چرایا ہے اور ان میں سے بعض تو (مثلاً شراب) مال کی حیثیت ہی نہیں رکھتے اور بعض کی مالیت میں اختلاف ہے تو عدم مالیت کا شبہ پیدا ہوگیا ۔

مسئلہ : امام قدوری ؒ نے فرمایا کہ ڈھولک یا طنبورہ چرانے میں بھی قطع ید نہ ہوگا ۔ کیونکہ یہ لہو و لعب کے آلات ہیں اور قرآن کریم چرانے کی صورت میں بھی قطع ید نہ ہوگا خواہ اس پر سونا چاندی چڑھا ہوا ہو ۔ امام شافعی ؒ فرماتے ہیں کہ قطع ید کیا جائے گا ۔ کیونکہ وہ باقیمت مال ہے

حتی کہ اس کی خرید و فروخت مروّج ہے۔ امام ابو یوسفؒ کا قول بھی امام شافعیؒ کے قول سے ملتا ہے۔ نیز ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ اگر مصحف پر لگا ہوا سونا چاندی نصاب سرقہ کے برابر ہو تو بھی ہاتھ کاٹا جائے گا، کیونکہ وہ سونا چاندی مصحف کا حصہ نہیں ہے بلکہ الگ چیز ہے۔

ظاہر الروایۃ یعنی عدم قطع کی وجہ یہ ہے کہ اسے لینے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے اسے تلاوۃ کرنے اور دیکھنے کے لیے لیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مصحف میں جو کچھ لکھا ہے اس کی تحریر کے لحاظ سے اس کی کوئی مالیت نہیں اور اس کی حفاظت بھی اسی مکتوب یا تحریر کی وجہ سے کی جاتی ہے۔ جلد یا اوراق یا نقش و نگار کی وجہ سے نہیں کی جاتی۔ کیونکہ یہ تو تحریر کے تابع ہیں اور ثانوی حیثیت رکھتے ہیں اور تابع چیز کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔ مثلاً کسی شخص نے وہ برتن چرا لیا جو شراب سے بھرا ہوا ہے، خواہ برتن کی قیمت دس درہم سے بڑھ بھی جائے (تو چوری کی سزا نہ ہوگی کیونکہ برتن شراب کے تابع ہوتا ہے)۔

مسئلہ: مسجد حرام کا دروازہ چرانے کی صورت میں بھی قطع ید نہ ہوگا۔ کیونکہ دروازے کو کسی مقام میں محفوظ کرنا مقصود نہیں ہوتا۔ تو احاطہ کے پھاٹک کی طرح بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ہوگا۔ کیونکہ گھر کے دروازے سے گھر کے سامان کی حفاظت مقصود ہوتی ہے۔ مگر مسجد

کے دروازے سے مسجد کے سامان کی حفاظت مقصود نہیں ہوتی ۔ کیونکہ مسجد کا سامان چرانے کی بناء پر قطع لازم نہیں آتا ۔

مسئلہ : امام قدوری نے فرمایا کہ اگر سونے کی صلیب یا شطرنج یا نرد چرا لے تو قطع نہ ہوگا ۔ کیونکہ چرانے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے شرعی طور پر ممنوع شے سے روکنے کے لیے اسے ضائع کرنے کے لیے اٹھایا تھا ۔ بخلاف اس سکے کے جس پر تصویر ہو کیونکہ ایسا سکہ عبادت کے لیے نہیں بنایا جاتا ۔ لہذا اس صورت میں یہ شبہ نہ ہوگا کہ اسے توڑنا مباح ہے ۔

امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ اگر صلیب گرجا میں ہو تو قطع نہ ہوگا ۔ کیونکہ اسے حفاظت حاصل نہیں ۔ اگر کسی کے گھر میں ہو تو قطع لازم ہوگا ۔ کیونکہ اس میں مالیت بھی پورے طور پر پائی جاتی ہے اور اسے حفاظت بھی حاصل ہوتی ہے ۔

مسئلہ : آزاد بچے کو چرانے میں قطع نہیں خواہ وہ زیور بھی پہنے ہوئے ہو ۔ کیونکہ آزاد آدمی مال نہیں ہوتا اور اس پر جو زیور ہے وہ اس کے تابع ہے ۔ کیونکہ وہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے اسے چپ کرانے کے لیے اٹھایا تھا یا اس لیے اٹھایا کہ اسے دودھ پلانے والی کے پاس لے جاؤں ۔

امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ جب اس نے نصاب کے قدر زیور پہن رکھا ہو تو اس کے اٹھانے کی صورت میں قطع

ہوگا ۔ کیونکہ صرف زیور چرانے میں بھی قطع لازم ہوتا ہے ۔
تو دوسری چیز کے ساتھ چرانے میں بھی واجب ہوگا ۔ یہ
اختلاف اس صورت میں بھی ہے کہ جب شراب ، نبیذ یا ثرید
سے بھرا ہوا چاندی کا برتن چرائے ۔ اور اس بچے کے بارے
میں بھی اختلاف ہے جو نہ چل سکتا ہے اور نہ بول سکتا
ہے ۔ یعنی اپنے ذاتی اختیار میں نہ ہو (اگر چلنے پھرنے
اور بات چیت کرنے والے بچے کو چرائے تو بالاتفاق قطع ید
نہیں کیونکہ وہ اپنے ذاتی اختیار میں ہوتا ہے) ۔

مسئلہ : اگر بالغ غلام کو چرا لیا تو قطع نہ ہوگا ۔
کیونکہ یہ تو چھین لینے یا فریب دینے کی صورت ہے ۔ (اس
کی سزا الگ ہے) چھوٹے یعنی نابالغ غلام کے چرانے میں
قطع ہوگا ۔ کیونکہ سرقہ کی پوری تعریف پائی گئی ۔ البتہ
اگر نابالغ غلام ایسا ہو کہ اپنے بارے میں بتلا سکتا ہو
(تو قطع نہ ہوگا) کیونکہ وہ اور بالغ اپنے ذاتی اختیار میں
ہوتے ہیں (شور وغیرہ کرکے اپنے آپ کو بچا سکتے ہیں) ۔

امام ابو یوسف؇ فرماتے ہیں کہ صغیر غلام کے چرانے
میں استحسان کے مد نظر قطع نہیں ، خواہ وہ بے سمجھ ہو
اور اچھی طرح بات چیت بھی نہ کر سکتا ہو ۔ کیونکہ وہ
ایک لحاظ سے آدمی ہے اور ایک جہت سے مال ہے ۔

امام محمد؇ اور امام ابو حنیفہ؇ کا ارشاد ہے کہ وہ مطلق
طور پر مال ہے ۔ کیونکہ اس سے انتفاع کیا جا سکتا ہے ۔
یا کم از کم کچھ عرصے کے بعد اس سے نفع حاصل کیا

جا سکتا ہے ۔ البتہ اس کے ساتھ آدمیت کے معنے چسپاں کیے گئے ہیں (تو ان معنوں کے انضمام سے مال ہونے کی حیثیت میں فرق نہیں آتا لہذا قطع لازم ہوگا) ۔

مسئلہ : اور تمام دفاتر کے چرانے میں قطع نہیں (دفاتر سے مراد رجسٹر ہیں) کیونکہ ان کا مقصد تو وہ تحریر ہے جو ان میں مکتوب ہے اور یہ تحریر مال نہیں ہے ۔ البتہ دفاتر حساب میں قطع ہوگا ۔ کیونکہ جو کچھ رجسٹر میں لکھا گیا ہے اس کا لینا مقصود نہیں ہے بلکہ نفس کاغذات ہی مقصود ہیں ۔

مسئلہ : امام قدوری نے فرمایا کہ کتے یا چیتے کی چوری میں قطع نہیں ، کیونکہ ان کی جنس میں ایسی اباحت پائی جاتی ہے جس میں لوگوں کو دلچسپی نہیں ۔ دوسری بات یہ ہے کہ کتے کی مالیت میں علماء کا اختلاف ظاہر ہے ۔ پس اس سے شبہ پیدا ہوگیا ۔

مسئلہ : دف ، طبلہ ، بربط اور بانسری کی چوری میں قطع نہ ہوگا ۔ کیونکہ صاحبین کے نزدیک ان اشیاء کی کوئی قیمت نہیں ہوتی اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک لینے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے انہیں توڑنے کی غرض سے اٹھایا ہے ۔

ساگوان ، نیزے کی لکڑی ، آبنوس اور صندل کے چرانے میں قطع ہوگا ۔ کیونکہ یہ ایسے مال ہوتے ہیں جن کی حفاظت کی جاتی ہے اور لوگوں میں کمیاب ہیں اور دارالاسلام میں

اپنی اصلی مباح صورت میں نہیں پائے جاتے۔

مسئلہ : امام محمدؒ الجامع الصغیر میں فرماتے ہیں کہ سبز نگینے ، یاقوت اور زبرجد کی چوری میں ہاتھ کاٹا جائے گا۔ کیونکہ نفیس اور قیمتی اموال ہیں جو اپنی اصلی صورت کے لحاظ سے دارالاسلام میں مباح کے طور پر نہیں پائے جاتے ، کہ لوگوں کو ان میں رغبت نہ ہو تو یہ سونے اور چاندی کی طرح ہوں گے۔

مسئلہ : اگر لکڑی سے برتن یا دروازے بنا لیے گئے تو ان کے چوری کرنے میں قطع ہوگا۔ کیونکہ وہ ساخت اور صفت کے لحاظ سے اموال نفیسہ کے زمرے میں شامل ہوں گے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ ان کی حفاظت کی جاتی ہے ؟ بخلاف چٹائی کے کیونکہ اس کی صنعت اور ساخت اس کی جنس پر غالب نہیں ہوتی۔ حتی کہ اسے غیر محفوظ مقام پر بھی بچھایا جاتا ہے۔

بغدادی چٹائی کے بارے میں مشایخ کا کہنا ہے کہ اسے چرانے کی صورت میں قطع واجب ہوگا۔ کیونکہ اس میں ساخت اپنی جنس پر غالب آ جاتی ہے۔

یاد رہے کہ اس دروازے کی چوری سے قطع ید لازم ہوگا جو دیوار میں لگا ہوا نہ ہو اور ہلکا ہو کہ ایک آدمی کے لیے اس کا اٹھا لینا ممکن ہو۔ کیونکہ اس سے بھاری دروازے میں لوگوں کو چرانے کی رغبت نہیں ہوتی۔ (الجامع الصغیر کی شروح میں مذکور ہے کہ ہلکے اور بھاری کے لحاظ

سے کوئی فرق نہیں ۔ کیونکہ بھاری ہونے سے مالیت میں کمی نہیں آتی بلکہ اضافہ ہوتا ہے) ۔

مسئلہ : خیانت کرنے والے مرد یا خائنہ عورت پر قطع نہیں ہے ۔ کیونکہ حفاظت میں کمی ہوتی ہے ۔ (یعنی جو شخص کسی امانت سے کچھ چرا لے تو اس پر قطع ید نہ ہوگا) نہ ہی چھین کر لے جانے والے اور نہ ہی اچک کر لے جانے والے پر قطع ید کی سزا ہوگی ۔ کیونکہ یہ اپنے فعل کو علانیہ طور پر کرتے ہیں (ان پر تعریف سرقہ صادق نہیں آتی) انھیں کیونکر قطع ید کی سزا دی جا سکتی ہے ۔ جب کہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے ۔ کہ اچک لے جانے والے ، چھین کر لے جانے والے اور خیانت کرنے والے پر قطع نہیں ہے ۔

مسئلہ : اور کفن چور پر بھی قطع ید کی سزا نہ ہوگی ۔ یہ امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کی رائے ہے ۔ امام ابو یوسف اور امام شافعیؒ قطع ید کے قائل ہیں ۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے ۔ کہ جو کفن چوری کرے گا ہم اسے قطع کی سزا دیں گے ۔ دوسری بات یہ ہے کہ کفن قیمتی مال ہوتا ہے اور ایسی جگہ با حفاظت پڑا ہے جو ایسی چیز کے لیے حفاظت کی جگہ ہے ۔

طرفینؒ کی دلیل یہ ہے کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے ۔ کہ مختفی پر قطع نہیں اور مختفی اہل مدینہ کی لغت میں کفن چور کو کہا جاتا ہے ۔ دوسری بات یہ ہے کہ ملکیت میں

شبہ موجود ہے کیونکہ میت کی در حقیقت کوئی ملکیت نہیں ہوتی اور نہ ہی وارث کی ملکیت باقی رہ جاتی ہے کیونکہ میت کی ضرورت دوسروں سے مقدم ہوتی ہے ۔ اس لیے ہاتھ کاٹنے کے مقصود یعنی زجر و تنبیہ میں قصور واقع ہوگیا ۔ کیونکہ اس نوع کی جنایۃ شاذ و نادر ہی وجود میں آتی ہے اور جو حدیث امام ابو یوسفؒ اور امام شافعیؒ نے پیش کی ہے وہ غیر مرفوع ہے یعنی صحابی کا قول ہے یا یہ حکم سیاست پر محمول ہے ۔

اگر قبر کسی مقفل مکان میں ہو تو صحیح روایت کے مطابق اس کا کفن چرانے والے کے بارے میں بھی اختلاف ہے ۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں اور اسی طرح اس صورت میں بھی ہے کہ جب کفن ایک ایسے تابوت سے چرائے جو قافلے کے ساتھ ہے اور جس میں میت ہے ۔ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں (یعنی فریقین کے دلائل کا ذکر کیا جا چکا ہے) ۔ بیت المال سے چرانے والے پر بھی قطع نہ ہوگا ۔ کیونکہ وہ عوام کا مال ہے اور چور خود بھی انھیں میں سے ایک ہے ۔

مسئلہ : اور اس مال کے چرانے میں بھی قطع ید لازم نہ ہوگا ۔ جس میں چور کی اپنی شراکت ہے (کیونکہ اس مال میں چور کا اپنا حق بھی ہے ۔ لہٰذا شبہ کی بناء پر حد ساقط ہو جائے گی) ۔

مسئلہ : اور اگر ایک شخص کے دوسرے کے ذمے درہم ہیں اور اس نے دوسرے کے اس جیسے اتنے ہی درہم

چرا لیے تو قطع لازم نہ ہوگا. گویا کہ یہ اپنا حق وصول کر لینا ہوا) خواہ یہ فی الحال واجب الادا ہوں یا میعاد کے بعد ہوں. استحسان کے مد نظر دونوں صورتیں برابر ہیں کیونکہ میعاد تو مطالبے میں تاخیر کے لیے ہوتی ہے. اگر وقت سے پہلے اپنا مال لے لیا تو گویا اپنا حق وصول کر لیا. اگر اپنے حق سے زیادہ چرا لے تو بھی قطع لازم نہ ہوگا. کیونکہ وہ اپنے حق کے مقدار کی نسبت سے اس مسروقہ مال میں شریک متصور ہوگا، اگر اس کا سامان چرائے تو قطع لازم ہوگا. کیونکہ اسے اس کے مال و متاع سے وصول کرنے کی ولایت حاصل نہیں. الا یہ کہ باہمی رضا مندی سے بیع ہو. (اگر مقروض قرض کے بدلے اپنی مرضی سے سامان دے دے تو جائز ہے). امام ابو یوسف[۲] فرماتے ہیں کہ سامان چرانے کی صورت میں قطع نہ ہوگا. کیونکہ بعض علماء کے نزدیک قرض خواہ کو مقروض کے سامان سے اس قدر لے لینا جس سے اس کا حق پورا ہو جائے یا بطور رہن کے جائز ہے.

ہم کہتے ہیں کہ بعض علماء کا یہ قول کسی ظاہری دلیل کی طرف مستند نہیں ہے، جب تک اس کے ساتھ دعوی متصل نہ ہو تو یہ قابل اعتبار نہ ہوگا. ہاں اگر چور یہ دعوی کرے (کہ میں نے اپنا حق وصول کرنے یا رہن کے لیے ایسا کیا ہے) تو اس سے حد ساقط ہو جائے گی. کیونکہ اس کا فعل مقام اجتہاد میں ظن اور شبہ سے خالی نہ ہوگا.

اگر اس کا حق دراہم ہوں اور وہ دیناروں کی چوری

کرے تو بعض حضرات نے کہا کہ قطع لازم ہوگا. کیونکہ اسے دینار چرانے کا کوئی حق نہ تھا . اور بعض نے کہا کہ قطع نہ ہوگا کیونکہ نقود ایک ہی جنس ہوتے ہیں .

مسئلہ : اگر ایک شخص نے کوئی مخصوص مال چرایا . پھر اس کا ہاتھ کاٹا گیا اور مال مسروقہ مالک کو واپس کیا گیا ، اس شخص نے پھر وہی مال چرا لیا اور وہ مال اسی سابقہ حالت پر باقی ہے ، تو دوسری بار ہاتھ نہ کاٹا جائے گا . قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ پھر اس کا ہاتھ کاٹا جاتا . امام ابو یوسفؒ سے قطع کی روایت منقول ہے اورامام شافعیؒ کا بھی یہی قول ہے . کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے اگر وہ دوبارہ چوری کرے تو اس کا بایاں پاؤں کاٹو . اور اس حدیث میں کوئی تفصیل نہیں (کہ مال بعینہ وہی ہو یا دوسرا ہو) . دوسری بات یہ ہے کہ دوسری چوری بھی پہلی کی طرح کامل چوری ہے . بلکہ پہلی چوری سے بھی بری ہے کیونکہ ایک دفعہ اسے سزا مل چکی ہے . تو گویا اس کی صورت یوں ہوگئی کہ مالک نے اپنا مخصوص مال چور کے ہاتھ فروخت کیا . پھر اسے چور سے خرید لیا اور چور نے چرا لیا (تو قطع ید لازم ہوتا ہے) .

ہماری دلیل یہ ہے کہ قطع کی سزا کے اجراء سے مال مسروقہ کی عصمت جاتی رہی . جیسا کہ آیندہ اوراق میں اس کی تفصیل إن شاء الله بیان کی جائے گی اور مالک کو واپس دینے میں اگرچہ حقیقی عصمت عود کر گئی (یعنی وہ مال

پہلے کی طرح محترم ہوگیا) لیکن عصمت ساقط ہونے کا شبہ اس لحاظ سے باقی ہے کہ ملک اور محل واحد ہے اور قطع ید کی سزا بھی واحد ہے۔ بخلاف بیع کی صورت کے کہ وہاں سبب کے مختلف ہونے کی بناء پر ملک میں بھی اختلاف آگیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اسی چور کا دوبارہ چوری کرنا نادر الوقوع ہے۔ کیونکہ وہ ایک بار سزا کا مزا چکھ چکا ہے تو اب حد قائم کرنا فائدہ سے خالی ہوگا کہ جرم میں کمی آجائے (لیکن یہ مقصد تو حاصل نہ ہوا) تو یہ صورت ایسے ہوگی جیسے کہ ایک شخص دوسرے کی زناء کی تہمت لگائے اور اس پر حد قذف جاری کی جائے اور پھر اسی پر زناء کی تہمت لگائے جس کو پہلے لگائی تھی۔ (تو دوبارہ اس پر حد قذف نہ ہوگی)۔

مسئلہ: امام قدوری نے فرمایا: اگر اس مال کی حالت میں تغیر آجائے۔ مثلاً پہلے سوت چرایا اور اس کا ہاتھ کاٹا گیا اور مال واپس مالک کو مل گیا۔ مالک نے اس سوت سے کپڑا بنوا لیا اور چور نے وہی کپڑا چرا لیا تو قطع کیا جائے گا۔ کیونکہ اس مخصوص چیز میں تغیر آچکا ہے۔ اسی بناء پر اگر کوئی شخص سوت چھین کر کپڑا بنوا لے تو کپڑا اس کی ملکیت ہوگا (اور سوت کا ضامن ہوگا) اور ہر محل میں تبدل کی یہی علامت ہے۔ جب تغیر آگیا تو اتحاد محل اور اتحاد قطع کا جو شبہ پیدا ہوا تھا وہ معدوم ہوگیا لہذا دوبارہ قطع واجب ہوگا۔

فَصلٌ فِي الْحَرْزِ وَالْأَخْذِ مِنْهُ

محفوظ جگہ اور اس سے لینے کے بیان میں

مسئلہ: اگر کسی نے اپنے باپ کی یا بیٹے کی یا ذی رحم محرم کی چوری کی تو ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ کیونکہ پہلی صورت میں یعنی والدین یا بیٹا جن میں پیدائشی قرابت ہوتی ہے ان میں ایک تو ایک دوسرے کے مال لینے کی گنجائش ہوتی ہے اور دوسرے محفوظ جگہ میں آنے جانے کی کوئی ممانعت نہیں ہوتی۔ اور دوسری صورت یعنی ذی رحم محرم کے حق میں دوسری وجہ موجود ہے (کہ ان کے گھر بھی آمد و رفت کی ممانعت نہیں ہوتی)۔ اس بناء پر شریعۃ نے دائمی محرمات عورتوں کے زینت کے اعضاء ظاہرہ کو دیکھنا مباح قرار دیا ہے۔ بخلاف دوستوں کے (اگر وہ ایک دوسرے کے گھر میں محفوظ جگہ تک آمد و رفت رکھیں لیکن چوری کی صورت میں ہاتھ کاٹا جائے گا) کیونکہ چوری کا ارتکاب کر کے اس نے عداوت سے کام لیا۔ دوسری صورت (یعنی ذی رحم محرم کی چوری کرنے) میں امام شافعیؒ کا اختلاف ہے۔ کیونکہ انہوں نے قرابۃ محرمہ کو قرابۃ بعیدہ سے لاحق کیا ہے۔ اس کی تفصیل ہم کتاب العتاق میں بیان کر چکے ہیں۔

مسئلہ : اگر ذی رحم محرم کے گھر سے کسی دوسرے کا مال چرا لے تو مناسب ہے کہ قطع نہ کیا جائے۔ اور اگر ذی رحم محرم کا مال کسی دوسرے کے گھر سے چرائے تو قطع کیا جائے۔ حفاظت اور عدم حفاظت کا اعتبار کیا جائے گا (یعنی پہلی صورت حفاظت کی نہیں۔ دوسری حفاظت کی ہے۔ کیونکہ غیر کے گھر میں محفوظ جگہ پر جانے کی ممانعت ہوتی ہے)۔

مسئلہ : اگر رضاعی ماں کی چوری کرے تو قطع ہوگا۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں۔ قطع نہیں کیا جائے گا ، کیونکہ انسان اپنی رضاعی ماں کے ہاں بغیر اجازت اور اطلاع کے جا سکتا ہے۔ بخلاف رضاعی بہن کے کیونکہ اس کے پاس اس طرح بلا تکلف جانے کی عادت نہیں ہوتی۔ اور ظاہر الروایۃ کی وجہ یہ ہے کہ ان میں باہمی کوئی خونی رشتہ نہیں اور جو محرمیۃ خونی رشتے کے بغیر ہوتی ہے اس کا احترام کم ہی ہوتا ہے۔ مثلاً کسی عورت سے زناء کیا یا شہوت سے اس کا بوسہ لیا تو اس کی ماں حرام ہے (یعنی زانی اس سے نکاح نہیں کر سکتا) مگر اس میں احترام نہیں ہوتا۔ اور اس سے زیادہ قریب اس کی رضاعی بہن ہوتی ہے۔ (اور باوجود حرمۃ رضاعۃ کے احترام کے اگر اس کا مال چرائے گا تو ہاتھ کاٹا جائے گا) اس کی وجہ یہ ہے کہ رضاعت کی شہرت کم ہی ہوتی ہے تو تہمت اور الزام سے احتراز کرنے کے

لیے باہمی انبساط. آمد و رفت اور میل جول زیادہ نہیں ہوتا بخلاف رشتۂ نسب کے (نسب کا علم ہر شخص کو ہوتا ہے اور ان کے ہاں کثرت آمدورفت میں کوئی الزام نہیں ہوتا).

مسئلہ : اگر خاوند اور بیوی دونوں میں سے کسی نے دوسرے کا مال چرایا ، یا غلام نے آقا کا یا آقا کی بیوی یا بیوی کے خاوند کی چوری کی تو قطع نہیں کیا جائے گا . کیونکہ انہیں عادۃً ایک دوسرے کے ہاں آمدورفت کی اجازت ہوتی ہے. اگر زوجین میں سے کسی ایک نے دوسرے کی خصوصاً محفوظ جگہ سے کہ جہاں دونوں سکونت نہیں رکھتے چوری کر لی تو ہمارے نزدیک یہی حکم ہوگا (یعنی قطع نہ کیا جائے گا) کیونکہ شوہر اور بیوی میں عادت اور دلالت کے طور پر مالی لین دین اور انبساط ہوتا ہے . امام شافعیؒ کو اس سے اختلاف ہے . اور یہ گواہی میں اختلاف کی نظیر ہے . (ہمارے نزدیک احد الزوجین کی شہادۃ دوسرے کے حق میں قبول نہیں کی جاتی اور امام شافعیؒ کے نزدیک مقبول ہے) .

مسئلہ : اگر آقا مکاتب کی چوری کرے تو قطع نہ ہوگا . کیونکہ اس کی کمائی میں آقا کا حق بھی ہے . اسی طرح اگر مال غنیمت میں سے کوئی لشکری چرا لے توقطع نہ ہوگا کیونکہ مال غنیمت میں لشکری کا بھی

حق ہے ۔ اور حضرت علیؓ سے بھی اسی طرح منقول ہے کہ آپ نے بھی یہی علة بیان کی ، اور حد کے اجراء سے احتراز کیا ۔

مسئلہ : امام قدوریؒ نے فرمایا ۔ کہ حرز یعنی مقام محفوظ کی دو قسمیں ہیں ۔ ایک وہ حفاظت جو خود مکان کی وجہ سے ہو مثلاً گھر اور کوٹھڑیاں ۔ دوسرا وہ حرز جو نگاہبان کی وجہ سے ہو ۔ مصنفؒ فرماتے ہیں ۔ کہ حرز ایک ضروری امر ہے کیونکہ کوئی چیز خفیہ نکال لینا حرز کے بغیر متصور نہیں ہو سکتی ۔ پھر یہ حرز کبھی تو مکان کی وجہ سے ہوتا ہے اور حرز اس مکان کو کہا جاتا ہے جو مال و متاع کی حفاظت کے لیے تعمیر کیا جاتا ہے ۔ جیسے گھر ۔ کوٹھڑی ۔ صندوق اور دکان وغیرہ ۔ اور گاہے حرز محافظ کی وجہ سے ہوتا ہے ۔ مثلاً جو شخص راستہ میں بیٹھ گیا یا مسجد میں بیٹھ گیا اور سامان اپنے پاس رکھ لیا تو یہ مال و متاع اس کی حرز و حفاظت میں ہے ۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کا ہاتھ کاٹ دیا تھا جس نے صفوان بن امیہ کی چادر سر کے نیچے سے چرا لی تھی اور وہ مسجد میں سو رہے تھے ۔

مسئلہ : اور جو چیز مکان کے اندر محفوظ ہے اس کا نگاہبان کے ساتھ احراز ضروری نہیں ہے ۔ اور یہی صحیح ہے ۔ کیونکہ محافظ کے بغیر بھی وہ سامان محفوظ ہے ۔ کیونکہ وہ گھر میں پڑا ہے خواہ مکان کا دروازہ

ہی نہ ہو یا ہو تو کھلا ہو۔ وہاں سے چوری کرنے والے کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ کیونکہ عمارات حفاظت کی خاطر ہی بنائی جاتی ہیں۔ اور ہاتھ اس صورت میں کاٹا جائے گا جب کہ مال مسروقہ مکان سے نکال لائے کیونکہ باہر نکالنے سے پہلے مالک کا قبضہ قائم ہے۔ بخلاف اس صورت کے جب کہ محافظ موجود ہو اس صورت میں مال کو ہاتھ میں لینے ہی سے قطع واجب ہوگا۔ کیونکہ چور کے ہاتھ میں لینے ہی سے مالک کا قبضہ جاتا رہتا ہے۔ پس چوری کی صورت مکمل ہوگی۔

محافظ جاگ رہا ہو یا سویا ہوا ہو دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں اور سامان اس کے نیچے ہو یا اس کے پاس پڑا ہو۔ یہی صحیح ہے۔ کیونکہ سامان کے پاس سویا ہوا شخص بھی عادۃً اس سامان کا محافظ ہی شمار کیا جاتا ہے۔ اور اسی بناء پر اپنے پاس امانت رکھنے والا یا عاریۃً رکھنے والا امانت اور مستعیر شے کا ضامن نہ ہوگا۔ (یعنی جب وہ امانت یا عاریت کا سامان پاس رکھ کر سو رہا ہو اور کوئی چرالے) کیونکہ اسے ضائع کرنے والا نہیں کہا جا سکتا۔ مگر فتاوی ظہیریۃ میں اس کے خلاف مذکور ہے۔

مسئلہ: امام قدوریؒ نے فرمایا۔ جس شخص نے حفاظت یا غیر حفاظت سے کوئی چیز چرائی حالیکہ اس کا مالک پاس بیٹھا حفاظت کر رہا ہے تو قطع لازم

ہوگا ۔ کیونکہ اس نے محفوظ مقام سے مال چرایا ہے اس لیے کہ پہلی صورت میں مکان والا حرز تھا اور دوسری صورت میں محافظ والا ۔

مسئلہ : اگر کوئی شخص حمام سے یا گھر سے جس میں ہر شخص کو آنے جانے کی اجازت ہے کچھ مال چرائے تو قطع نہ ہوگا ۔ کیونکہ (حمام میں) عادةً داخل ہونے کی اجازت ہوتی ہے اور گھر میں حقیقةً داخل ہونے کی اجازت ہے ۔ لہذا حرز میں خلل و قصور آ گیا ۔ تاجروں کی دکانیں اور سرائیں بھی اسی حکم کے تحت داخل ہیں ۔ ہاں اگر رات کے وقت وہاں سے چوری کر لے تو سزا ہوگی ۔ کیونکہ ان کی تعمیر تو مال کی حفاظت کے لیے کی جاتی ہے ۔ اور آنے جانے کی اجازت دن کے اوقات سے مخصوص ہوتی ہے ۔

مسئلہ ۔ جس شخص نے مسجد سے سامان چرایا حالیکہ مالک سامان پاس ہی ہے تو قطع لازم ہوگا ۔ کیونکہ وہ سامان محافظ کی وجہ سے حفاظت میں ہے ۔ البتہ مساجد کی تعمیر حفاظت سامان کے لیے نہیں ہوتی ۔ اس لیے صرف مسجد میں ہونے کی بناء پر سامان محفوظ مقام میں نہیں ہوتا ۔ بخلاف حمام اور اس گھر کے جس میں لوگوں کو دخول کا اذن عام ہوتا ہے اگر وہاں مالک موجود بھی ہو تو ہاتھ نہیں کٹا جائے گا کیونکہ ان مکانوں کی تعمیر کا مقصد ہی حفاظت اموال ہوتا ہے ۔

تو مکان ہی حرز ہوگا اور محافظ کی نگہداشت کا اعتبار نہ ہوگا (مگر دخول کے اذن عام کی بناء پر قطع نہ ہوگا) ۔

مسئلہ : اگر مہمان میزبان کے ہاں سے کچھ چرا لے تو قطع نہ ہوگا ۔ کیونکہ وہ گھر مہمان کے حق میں مقام محفوظ نہیں رہا ۔ اس لیے کہ اسے وہاں داخل ہونے کی اجازت ہے ۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس کی حیثیت تو گھر والوں کی ہے تو اس کا فعل خیانت شمار ہوگا چوری نہ ہو گا ۔

مسئلہ : جس نے کوئی چیز چرائی مگر مال مسروقہ کو گھر سے نہیں نکالا تو قطع نہ ہوگا ۔ کیونکہ تمام گھر مقام محفوظ ہے اس لیے وہاں سے نکالنا ضروری ہوگا ۔ کیونکہ مکان اور جو کچھ اس میں ہے معنوی لحاظ سے مالک کی ملکیۃ ہے اور اس کے قبضے میں ہے ۔ تو عدم اخذ کا شبہ پیدا ہو گیا (اور حد ساقط ہو گئی) ۔

مسئلہ : اگر اس گھر میں کوٹھڑیاں ہوں اور وہ کوٹھڑی سے نکال کر صحن میں لے آئے تو قطع لازم ہوگا کیونکہ ہر کوٹھڑی اپنے رہنے والے کے لحاظ سے الگ الگ مقام محفوظ ہے ۔

مسئلہ : اگر ان کوٹھڑیوں میں رہنے والے کسی شخص نے کسی کوٹھڑی سے مال چرانے میں اعانت کی اور کچھ چرا لیا تو قطع لازم ہو گا ۔ جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں کہ ہر کوٹھڑی الگ الگ مقام محفوظ ہے ۔

مسئله : ایک چور نے کسی گھر میں نقب لگائی ، اندر داخل ہوا اور وہاں سے مال اٹھایا اور اس دوسرے شخص کو دے دیا جو باہر کھڑا تھا تو دونوں پر قطع نہ ہوگا ۔ اس لیے کہ پہلے شخص نے مال کو باہر نہیں نکالا کیونکہ مال کے باہر نکالنے سے پہلے مالک کا قابل اعتبار قبضہ موجود ہے ۔ اور دوسرے شخص پر سزا اس لیے واجب نہیں کہ اس کی طرف سے حرز یعنی مقام محفوظ میں کسی طرح کی دست درازی نہیں پائی گئی ۔ لہذا دونوں میں سے کس کی چوری بھی کامل نہیں ہے ۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ اگر اندر داخل آدمی نے اپنا ہاتھ باہر نکال کر مال پکڑایا تو اس پر قطع لازم ہوگا ۔ اور اگر دوسرا آدمی باہر سے اپنا ہاتھ اندر کرکے مال پکڑے تو دونوں پر قطع ہوگا ۔ اس مسئلے کی بناء اختلاف إن شاء الله آینده اوراق میں بیان کی جائے گی ۔

اگر داخل شخص مال کو اندر سے راستے میں پھینک دے اور باہر نکل کر اٹھا لے تو قطع لازم ہو گا ۔ امام زفرؒ فرماتے ہیں قطع نہیں کیا جائے گا ۔ کیونکہ راستے میں پھینک دینا قطع ید کا موجب نہیں ہے ۔ جیسا کہ اگر باہر نکل کر وہ مال نہ اٹھائے تو بالاتفاق قطع لازم نہیں ہے ۔ اسی طرح اگر چور گلی سے کوئی مال چرا لے جیسا کہ اسی مال کو کوئی دوسرا چور اٹھ لے تو امام زفرؒ کے نزدیک قطع نہ ہوگا ۔

ہماری دلیل یہ ہے. کہ مال کو گلی میں پھینک دینا عموماً چوروں کی عادت ہوتی ہے کیونکہ سارا مال ومتاع اٹھا کر نقب کے سوراخ یا دروازے سے نکلنا مشکل ہوتا ہے. یا گلی میں پھینک دینے سے چور کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اگر صاحب خانہ سے ہاتھا پائی ہو جائے تو وہ اس کے لیے فارغ ہو سکے. یا اگر بھاگنا پڑے تو آسانی سے راہ فرار اختیار کرسکے. اور اس صورت میں مالک کا قابل اعتبار قبضہ عارض نہیں. چور کا مال گلی میں پھینکنا اور نکل کر اٹھانا ایک ہی فعل ہے. اگر وہ وہاں سے نکل کر مال نہ اٹھائے تو مال کو ضائع کرنے والا ہوگا چور نہ ہوگا.

مسئلہ : امام قدوری نے فرمایا کہ چور سامان کو گدھے پر لاد کر اسے ہانکتے ہوئے باہر لے آئے (تو اس پر قطع واجب ہے) کیونکہ اس کے ہانکنے کی بناء پر گدھے کی رفتار اسی کی طرف منسوب ہوگی.

اگر مقام محفوظ میں ایک گروہ داخل ہوا (ان میں سے) بعض نے وہاں مال اٹھانے کا کام کیا تو سب کا ہاتھ کاٹا جائے گا. مصنف علیہ رحمۃ فرماتے کہ یہ استحسان کے مد نظر ہے. ورنہ قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ صرف اٹھانے والوں کے ہاتھ کاٹے جائیں. امام زفر کا بھی یہی قول ہے. کیونکہ اٹھانے والوں ہی نے مال کو باہر نکالا ہے اور چوری کا فعل انہیں سے پایۂ تکمیل تک پہنچا ہے.

ہم کہتے ہیں کہ تعاون کی بناء پر معنوی لحاظ سے سب کی طرف سے مال کا نکالنا پایا گیا۔ جیسا کہ سرقۂ کبری یعنی رہزنی کی صورت میں ہوتا ہے۔ (کہ اگر ان میں سے چند آدمی مال و متاع چھین لیں اور باقی پاس کھڑے رہیں تو سب پر رہزنی کی حد جاری ہوگی)۔ دوسری بات یہ ہے کہ چوروں کے درمیان عادت کے مطابق یہ طے شدہ امر ہوتا ہے کہ بعض تو سامان اٹھائیں گے اور بعض ان کی مدد اور مدافعت کے لیے کمر بستہ رہیں گے۔ لہذا دوسروں سے سزا ساقط کر دی جائے تو حد کے اجراء کا دروازہ ہی بند ہو جائے گا۔

مسئلہ : جس شخص نے کسی گھر میں نقب لگائی اور اپنا ہاتھ اندر داخل کرکے کوئی چیز اٹھا لی تو قطع واجب نہ ہوگا۔ اور امام ابو یوسفؒ سے املاء میں روایت ہے کہ قطع ہوگا کیونکہ اس نے محفوظ مقام سے مال نکالا ہے۔ اور یہی مقصد تھا۔ لہذا مکان میں داخل ہونا شرط نہ ہوگا۔ جیسا کہ کسی صراف کے صندوق میں ہاتھ ڈال کر اشرفی نکال لے (تو قطع واجب ہوتا ہے)۔

ہماری دلیل یہ ہے۔ کہ حرز کے ہتک اور توڑنے میں کمال شرط ہے تاکہ عدم یعنی نہ ہونے کا شبہ نہ رہے۔ اور یہ کمال اندر داخل ہونے کی صورت ہی میں ممکن ہے۔ اور اس کا اعتبار کرنا بھی ممکن ہے۔

کیونکہ عادۃً اندر داخل ہو کر ہی چوری کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔ بخلاف صندوق کے کہ اس میں تو ہاتھ ڈالنا ہی ممکن ہوتا ہے اور اندر داخل ہونا ممکن نہیں ہوتا۔ یہ صورت سابقہ مسئلے کے بھی خلاف ہے۔ کہ جب بعض لوگ سامان کو اٹھائیں کیونکہ ان کی عادت ہی یہی ہوتی ہے۔

مسئلہ: اگر جیب تراش نے ایسی تھیلی کاٹ لی جو آستین سے باہر تھی۔ تو قطع واجب نہ ہوگا اور اگر اس نے آستین میں ہاتھ ڈال کر تھیلی کاٹی تو قطع ہوگا کیونکہ پہلی صورت میں تھیلی کا باندھنا باہر کی طرف سے ہے۔ تو ظاہر سے گرہ کاٹنا پایا جائے گا۔ اور حرز یعنی مقام محفوظ کی ھتک نہ پائی گئی۔ اور دوسری صورت میں تھیلی کا باندھنا اندر کی طرف سے ہے۔ اور جیب تراش کا لینا اندر کی طرف سے ہوگا جو کہ مقام محفوظ تھا۔ اور وہ آستین ہے۔ اور اگر کاٹنے کی بجائے گرہ کھول کر تھیلی لے لے تو دونوں صورتوں میں حکم بر عکس ہو جائے گا۔ کیونکہ علۃ برعکس ہو گئی (یعنی اگر باہر سے گرہ کھولے تو ہاتھ کاٹا جائے گا اور اندر سے کھولے تو قطع نہ ہوگا)۔

امام ابو یوسفؒ کے رائے میں ہر حالت میں (ہاتھ) کاٹا جائےگا۔ کیونکہ مال یا تو آستین کی حرز میں ہے یا صاحب مال کی حفاظت میں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ حرز تو

آستین ہے کیونکہ مالک نے اس کی حفاظت پر اعتماد کیا ہے۔ اور اس کا اپنا مقصد ہے کہ سفر طے کرنے یا آرام کرے (یعنی اس نے اپنے آپ کو مال کا محافظ نہیں مقرر کیا)۔ تو یہ بوریوں کے مشابہ ہوگا (یعنی ایک شخص نے بوریوں میں مال بھر کر جانور پر لاد دیا۔ اگر کوئی شخص بوری پھاڑ کر مال نکال لے تو قطع واجب ہوگا۔ کیونکہ لادنے والے نے بوریوں ہی کو حرز ٹھیرایا ہے۔ لیکن اگر چور پوری بوری چرالے تو قطع نہ ہوگا کیونکہ مالک بوری کا محافظ نہیں۔ بلکہ اس کا مقصد تو سفر کرنا ہے۔ مقام محفوظ تو بوریاں ہیں)۔

اگر اونٹوں کی قطار میں سے کوئی اونٹ یا ان سے بوجھ چرا لیا تو قطع نہ ہوگا۔ کیونکہ اس صورت میں احراز مقصود نہیں۔ تو احراز نہ ہونے کا شبہ پیدا ہو گیا۔ کیونکہ آگے سے کھینچنے والے پیچھے سے ہانکنے والے اور ان پر سواری کرنے والے کا مقصد تو سفر طے کرنا ہوتا ہے یا مال و اسباب کا پہنچانا۔ حرز و حفظ مقصود نہیں ہوتا۔ حتی کہ اگر اس سامان کے پیچھے پیچھے کوئی محافظ ہو تو پھر ہاتھ کاٹا جائے گا۔

اگر بوجھ کو پھاڑ کر کچھ نکال لیا تو قطع کیا جائے گا۔ کیونکہ اس صورت میں بوریاں حرز یعنی مقام محفوظ ہیں۔ بوریوں میں سامان ڈالنے کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ سامان محفوظ رہے۔ جیسے کہ آستین

کی صورت میں ہوتا ہے۔ لہذا بوری کو پھاڑ کر سامان نکالنا مقام محفوظ سے لینا ہوگا اور قطع واجب ہوگا۔

اگر ایسی بوری چرا لے کہ جس میں سامان بھرا ہے اور مالک اس کی حفاظت بھی کر رہا ہے یا اس کے اوپر سویا ہوا ہے تو قطع واجب ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے، کہ بوری کسی ایسی جگہ ہو جو مقام محفوظ نہیں ہے، جیسے واستے میں پڑی ہو، تو یہ اپنے مالک کی وجہ سے حرز میں ہوگی کیونکہ وہی حفاظت کر رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حفاظت معتاد کا اعتبار ہے۔ اس کے پاس بیٹھے رہنا یا سو جانا عادةً حفاظت ہی شمار ہوگا۔ اسی طرح بوری کے قریب سونا بھی حفاظت میں شامل ہے جیسا کہ ہم نے پہلے اختیار کیا ہے۔ اور جامع صغیر کے بعض نسخوں میں مذکور ہے کہ بوری والا اسی پر سو رہا ہو یا کہیں بیٹھا ہوا اس کی حفاظت کر رہا ہو۔ اور یہ بات ہمارے قول مختار کی تائید کرتی ہے۔

فَصْلٌ فِيْ كَيْفِيَّةِ الْقَطْعِ وَ اِثْبَاتِه

قطع کی کیفیت اور اس کے اثبات کے بیان میں

مسئلہ : چور کا ہاتھ دائیں گٹے (یعنی کلائی کے ساتھ جو جوڑ ہے) سے کاٹا جائے اور داغ دیا جائے۔ کاٹنا اس آیت کی بناء پر ہے جو بیان کی گئی ہے اور دائیں ہاتھ کے کاٹنے کی دلیل حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قرأت ہے (السارق و السارقۃ فاقطعوا ایمانھما) یعنی چور مرد ہو یا عورت ان کے دائیں ہاتھ کاٹ دو۔ اور یہ قراءت مشہورہ ہے جس سے کتاب پر اضافہ کیا جا سکتا ہے)۔ اور گٹے یعنی کلائی سے کاٹنا اس بناء پر ہے کہ ہاتھ کا لفظ بغل تک شامل ہے۔ لیکن کلائی کا جوڑ ایک یقینی امر ہے (اور عقوبات میں یقینی امر پر عمل کیا جاتا ہے) اور یہ یقینی کیوں نہ ہو جب کہ نبی اکرم ﷺ نے چور کا ہاتھ کلائی سے کاٹنے کا حکم دیا تھا اور داغ دینا اس بنا پر ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا اس کا ہاتھ قطع کرو اور اسے داغ دو۔ دوسری بات یہ ہے۔ اگر داغ نہ دیا جائے تو خون بہ جانے کی وجہ سے ہلاکت کا خدشہ ہوتا

ہے۔ اور حد سے مراد زجرو تنبیہ ہوتی ہے نہ کہ تلف کرنا۔ (قطع کے بعد گرم لوہے سے زخم کو داغ دیتے ہیں تاکہ خون کا بہاؤ رک جائے)۔

مسئلہ : اگر دوبارہ چوری کرے تو اس کا بایاں ہاتھ کاٹ دیا جائے اگر سہ بارہ چوری کا مرتکب ہو تو قطع نہ ہوگا بلکہ اس کے توبہ کرنے تک قید میں رکھا جائے گا۔ یہ عدم قطع استحسان کے مد نظر ہے۔ اور مشایخ کا کہنا ہے کہ اس پر تعزیر بھی لگائی جائے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ تیسری بار چوری کرنے پر بایاں پاؤں کاٹا جائے اور چوتھی بار دایاں پاؤں کاٹ دیا جائے۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو چوری کرے اس کا ہاتھ کاٹ دو اور پھر کرے تو پھر قطع کرو اگر پھر کرے تو پھر قطع کرو۔ اور یہ حدیث اسی تفسیر کے ساتھ روایت کی گئی ہے جیسا کہ امام شافعیؒ کا مذہب ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ تیسری بار چوری کرنا پہلی بار چوری کرنے کی طرح جرم ہے بلکہ اس سے بڑھ کر ہے۔ لہذا حد شرح کا تقاضا بھی شدید ہوگا۔

ہماری دلیل اس بارے میں حضرت علیؓ کا قول ہے کہ مجھے اللہ تعالی سے حیاء آتی ہے کہ اس کا ایک ہاتھ بھی باقی نہ چھوڑوں کہ جس سے کھانا کھا سکے یا استنجاء کر سکے، یا ایک پاؤں بھی باقی نہ رہنے دوں کہ جس کے ذریعے چل سکے۔ جب باقی صحابہؓ نے آپ سے بحث کی

تو آپ نے اس حجۃ سے انھیں قائل کر لیا ۔ پس صحابہ کرام کا اجماع ہو گیا ۔ دوسری بات یہ ہے کہ دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں کاٹ دینے سے معنوی طور پر ہلاک کر دینے کے برابر ہے کیونکہ ایسا کرنے سے جنس منفعت کا زائل کرنا لازم آتا ہے ۔ حالیکہ حد صرف زجر کے لیے ہوتی ہے ۔ تیسری بات یہ ہے کہ دو بار سزا پانے کے بعد تیسری اور پھر چوتھی بار چوری کرنا شاذو نادر ہی وقوع میں آتا ہے ۔ اور زجر ایسے جرائم میں ہوتی ہے جو کثیر الوقوع ہوں ۔ قصاص کی نوعیت اس سے مختلف ہے ۔ (یہ در اصل ایک سوال کا جواب ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں کاٹ ڈالے تو قصاص میں اس کے بھی دونوں ہاتھ اور پاؤں کاٹ دئے جاتے ہیں ۔ حالیکہ یہ تمام دلائل قصاص میں بھی دئے جا سکتے ہیں) کیونکہ قصاص بندے کا حق ہے تو بندے کا حق پورا کرنے کے لیے ممکن طور پر قصاص لیا جائے گا ۔

امام شافعیؒ کی پیش کردہ حدیث کی سند میں امام طحاویؒ نے طعن کیا ہے ۔ یا اسے درست تسلیم کرنے کی صورت میں ہم اسے سیاست پر محمول کریں گے ۔

مسئلہ : اگر دایاں ہاتھ شل ہو یا کٹا ہوا ہو یا دایاں پاؤں کٹا ہوا ہو تو قطع نہ ہوگا کیونکہ اب قطع کرنے کی صورت میں پکڑنے اور چلنے کی جنس منفعت ہی زائل ہو جائے گی ۔ اسی طرح اگر اس کا بایاں پاؤں شل ہو تو بھی یہی حکم ہے ۔

اسی طرح اگر اس کا دایاں انگوٹھا کٹا ہوا ہو . یا شل ہو یا انگوٹھے کے علاوہ دو انگلیاں کٹی ہوئی ہوں یا شل ہوں تو بھی یہی حکم ہے کیونکہ صحیح گرفت انگوٹھے سے ہوتی ہے .

اگر انگوٹھے کے علاوہ ایک انگلی مقطوع ہو یا شل ہو تو اسے قطع کی سزا دی جائے گی . کیونکہ بائیں ہاتھ کی ایک انگلی نہ ہونے سے گرفت میں ظاہراً کوئی خلل نہیں آتا . بخلاف اس کے کہ جب دو انگلیاں نہ ہوں تو خلل ظاہر ہے . کیونکہ گرفت کی قوۃ ناقص ہونے میں دو انگلیاں بمنزلہ انگوٹھے کے ہوں گی .

مسئلہ : جب حاکم نے جلاد کو حکم دیا کہ چوری کرنے کے جرم میں اس شخص کا دایاں ہاتھ کاٹ دیا جائے ، جلاد نے عمداً یا غلطی سے بایاں ہاتھ کاٹ دیا تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جلاد پر کچھ واجب نہ ہوگا . صاحبین کا کہنا ہے کہ خطاء کی صورت میں کچھ نہ ہوگا مگر عمد کی صورت میں ضامن ہوگا . امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ خطاء کی صورت میں بھی ضامن ہوگا اور قیاس بھی یہی ہے . خطاء سے مراد اجتہادی غلطی ہے . (یعنی اللہ تعالی کے اس ارشاد : فاقطوا ایدیھما میں اسے غلطی لگی کہ آیۃ میں چونکہ مطلق ہے کیوں نہ بایاں ہاتھ کاٹ دیا جائے تاکہ کم از کم دائیں سے کام کاج تو کرسکے) . اگر اسے دائیں یا بائیں کی پہچان میں غلطی لگی ہو تو یہ غلطی قابل معافی نہ

ہوگی ۔ اور بعض حضرات نے کہا کہ اس صورت میں
بھی معذور سمجھا جائے گا ۔

امام زفرؒ کی یہ دلیل ہے کہ اس نے بیگناہ اور معصوم
ہاتھ کاٹ دیا اور حقوق العباد میں خطاء ساقط نہیں ہوتی ۔
لہذا جلاد ضامن ہوگا ۔ ہم کہتے ہیں کہ اس نے اجتہاد
میں غلطی کی کیونکہ نص قرآنی میں دائیں ہاتھ کی
تعیین نہیں ہے ۔ اور شرعی طور پر اجتہادی خطاء ساقط
ہو جاتی ہے ۔ صاحبین کہتے ہیں کہ اس نے بغیر کسی
حق اور تاویل کے معصوم ہاتھ کاٹ دیا ہے اور اس
نے یہ ظلم جان بوجھ کر کیا ہے لہذا قابل معافی نہ
ہوگا ۔ اور اجتہادی باتوں میں بھی اس قسم کا عفو نہیں
ہوتا (یعنی مجتہد اگر دلیل ظاہر کو چھوڑ کر کوئی
غلطی کرے تو اسے معاف نہیں کیا جاتا) اور مناسب تو
یہ تھا کہ اس سے قصاص لیا جاتا ۔ مگر شبہ کی بناء
پر قصاص نہ لیا گیا ۔ (شبہ یہ کہ اللہ تعالی کے ارشاد میں
ہاتھ کی تعیین نہیں) ۔

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں : ہم تسلیم کرتے ہیں
کہ اس نے بغیر حق کے اور تأویل کے معصوم ہاتھ
کاٹ ڈالا لیکن اس نے اس کی جنس سے وہ ہاتھ
بچا لیا ہے جو کٹنے والے سے بدرجہا بہتر ہے ، تو
اسے اتلاف نہیں کہا جائے گا ۔ جیسے کہ کسی شخص
نے دوسرے پر یہ شہادۃ دی کہ اس نے اپنا مال

اتنی قیمت پر بیچا ہے ، پھر اپنی شہادۃ سے رجوع کر لیا . (تو وہ ضامن نہ ہوگا) . اور اسی بناء پر اگر جلاد کے علاوہ کوئی شخص بھی اسی طرح قطع کرے تو ضامن نہ ہوگا . اور یہی صحیح ہے . اگر چور اپنا بایاں ہاتھ باہر نکالے اور کہے کہ یہ میرا دایاں ہاتھ ہے تو جلاد بالاتفاق ضامن نہ ہوگا ، کیونکہ جلاد نے اس کے کہنے پر قطع کیا ہے .

پھر عمد کی صورت میں امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک چور پر مال کی ضمان ہوگی کیونکہ بایاں ہاتھ کٹ جانے سے اس پر حد واقع نہ ہوئی . اور خطاء سے کاٹنے کی صورت میں بھی اسی طور پر مال مسروقہ کا ضامن ہوگا . اور طریقۂ اجتہاد کی صورت میں ضامن نہ ہوگا .

مسئلہ : اور چور کا ہاتھ اس وقت تک نہیں کاٹا جائےگا جب تک کہ مسروق منہ (یعنی صاحب مال) چوری کا مطالبہ نہ کرے کیونکہ چوری کے اظہار کے لیے دعوی دائر کرنا شرط ہے خواہ چور خود اقرار کرے یا اس پر گواہ شہادت دیں . ہمارے نزدیک دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں کیونکہ غیر کے مال پر کوئی جرم کرنا اسی وقت ظاہر ہوتا ہے کہ جب وہ دعوی دائر کرے . امام شافعیؒ کو اقرار کی صورت میں اختلاف ہے .

اسی طرح اگر ہاتھ کاٹتے وقت صاحب مال غائب ہو جائے تو ہمارے نزدیک قطع نہ ہوگا . کیونکہ حدود کے

باب میں حد کو پورا کرنا بھی حکم میں داخل ہے ۔ (لہذا اگر قطع کے وقت مدعی غائب ہو گیا تو حکمِ قاضی پورا نہ ہو سکے گا اور ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا) ۔

مسئلہ : (مستودع ۔ جس کے پاس امانت رکھی جائے ودیعۃ بھی امانت ہے ۔ غاصب جو کسی کا مال چھین لے ۔ مغصوب منہ جس کا مال چھینا گیا ہو) ۔ مستودع ۔ غاصب اور صاحب سود کو یہ حق حاصل ہے کہ ان کی چوری ہو جانے پر وہ چور کا ہاتھ کٹوا سکیں ۔ اور ودیعۃ کے مالک کا بھی حق ہے کہ وہ چور کا ہاتھ کٹوا سکے اور اسی طرح مغصوب منہ کو بھی اختیار ہے ۔

امام زفرؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ غاصب اور مستودع کے دعوی سے قطع نہیں کیا جائے گا ۔ مستعیر مستاجر ، مضارب ، مستبضع ، کسی چیز کو خرید کے طور پر قبضہ کرنے والے ، مرتہن اور ہر ایسے شخص کہ مالک کے سوا جس کا حفاظتی قبضہ ہو ، کی صورت میں مذکورہ اختلاف پایا جاتا ہے ۔ (مستعیر : کسی سے کوئی چیز مانگ کر عاریۃً لینے والا ۔ مستاجر : کرائے پر لینے والا ۔ مضارب : جس نے کسی سے کوئی مال نفع کی شراکت کے طور تجارت کے لیے لیا ہو ۔ مستبضع : جس نے کسی کا مال بطور احسان تجارت کے لیے لیا ہو ۔ مرتہن : جس کے پاس کوئی چیز بطور رہن موجود ہو ۔ حفاظتی

قبضے کی مثال جیسے مال وقف کا متولی۔ یا وصی) . اگر ان لوگوں کے ہاں سے چور نے مال چرایا تو حقیقی مالک کے دعوے سے بھی ہاتھ کاٹا جائے گا . البتہ راہن (رہن رکھنے والے) کے دعوی سے اسی وقت ہاتھ کاٹا جائے گا جب کہ قرض کی ادائیگی کے بعد مرتہن کے پاس رہن رکھا ہوا مال موجود ہو . کیونکہ قرض کی ادائیگی کے بغیر راہن کو مال مرہون کے مطالبے کا اختیار نہیں ہے .

امام شافعیؒ کا قول ان کے اس اصل پر مبنی ہے کہ ان کے نزدیک ان لوگوں کو واپس لینے کے بارے میں خصومة کا اختیار نہیں ہے . (اگر مالک موجود نہ ہو تو جس کے پاس مال ہے اس سے مال کی واپسی کے لیے یہ لوگ خصومت نہیں کر سکتے) . اور امام زفرؒ کے نزدیک یہ لوگ واپس لے سکتے ہیں البتہ واپس لینے میں خصومت کا اختیار حفاظت کی ضرورت کے مد نظر ہے ، تو یہ اختیار قطع ید کے حق میں ظاہر نہ ہوگا . کیونکہ قطع ید کی صورت میں مال کی عصمت اور احترام فوت ہوتا ہے .

ہماری دلیل یہ ہے کہ چوری بذات خود قطع ید کا موجب ہے . اور قاضی کے نزدیک حجة شرعی سے ثابت ہو چکی ہے . اور یہ حجت شرعی یہ ہے کہ دو گواہوں نے مطلقاً خصومت معتبرہ کے بعد شہادت دی ہے . اعتبار یہ ہے کہ ان لوگوں کو مال واپس لینے کا

اختیار ہے ۔ (اور چوری کے ثابت ہو جانے پر) سزائے قطع ید بھی پورے طور پر جاری ہوگی ۔ دعوی دائر کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مالک مال کا حق قائم رکھا جائے ، رہا مال کی عصمت کا ساقط ہونا تو سزائے حد پوری کی جانے کی ضرورت کے مد نظر ہے ۔ تو یہ سقوط معتبر نہ ہوگا ۔ اور ایسے شبہ کا کچھ اعتبار نہ ہوگا جس کے پیش آنے کا وہم ہے ۔ جیسے کہ مالک موجود ہو اور امانت دار غائب ہو ۔ تو ظاہر الروایت میں مالک کی خصومت سے قطع لازم ہوگا ۔ اگرچہ وہ موہوم شبہ موجود ہے کہ کہ شاید امانت دار نے چور کو مقام محفوظ میں داخل ہونے کی اجازت دے رکھی ہو ۔

مسئلہ : اگر چوری کی بناء پر ایک چور کا ہاتھ کاٹا گیا لیکن اس سے کسی دوسرے چور نے مال چرا لیا ، تو اب اس پہلے چور یا مالک سامان کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ دوسرے چور کے ہاتھ کٹوائیں کیونکہ پہلے چور کے حق میں وہ مال مال متقوم نہیں حتی کہ اگر یہ مال تلف ہو جائے تو اس پر ضمان واجب نہیں ہوتی ۔ تو اس مال کی یہ حیثیت نہیں ہے کہ وہ قطع ید کا موجب بن سکے ۔ اور ایک روایت کے مطابق پہلے چور کو مال کی واپسی کی خصومۃ کا حق ہے ۔ کیونکہ اسے اصل مالک کو واپس کرنا ہے اور یہ اس کی مجبوری ہے ۔

مسئلہ : اگر دوسرا چور ایسے وقت میں وہ مال چوری

کرے کہ ابھی تک پہلے چور کا ہاتھ نہیں کاٹا گیا ، یا کسی شبہ کی بنا پر اس پر حد جاری نہیں کی گئی ، تو پہلے چور کے مطالبہ کرنے پر دوسرے چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا کیونکہ مال مسروقہ کی قیمت کا ساقط ہونا قطع ید کی سزا کی ضرورت کے مد نظر تھا . اور موجودہ صورت میں وہ ضرورت موجود نہیں ہے ، تو یہ غاصب کی طرح ہوگا (کہ اگر کوئی شخص غاصب سے مال چرا لے تو اس کے مطالبے پر چور کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے) .

مسئلہ : ایک شخص نے چوری کی مگر حاکم کے پاس مقدمہ جانے سے پہلے پہلے چور نے مسروقہ مال مالک کو واپس کر دیا تو قطع واجب نہ ہوگا . امام ابو یوسفؒ سے مروی ہے کہ قطع کیا جائے گا جیسا کہ حاکم کے پاس مقدمہ کرنے کے بعد واپس کیا جاتا ہے . ظاہر الروایۃ کی وجہ یہ ہے کہ چوری کا اظہار کرنے کے لیے حاکم کے پاس مقدمہ دائر کرنا شرط ہے . بخلاف اس کے کہ جب مقدمہ کے بعد واپس کرے تو خصومت کا مقصود حاصل ہو جانے کی بناء پر خصومت ختم ہوگئی . پس وہ تقدیراً باقی ہے .

مسئلہ : جب حاکم نے چور کے بارے قطع کا فیصلہ کر دیا لیکن مالک نے مال مسروقہ چور کو ہبہ کر دیا یعنی اس کے سپرد بھی کردیا تو قطع واجب نہ رہے گا . اسی طرح جب مالک مال مسروقہ کو چور کے ہاتھ فروخت کر دے (تو بھی قطع واجب نہ ہوگا) . امام زفرؒ اور امام

شافعیؒ قطع کے قائل ہیں اور امام ابو یوسفؒ سے بھی یہی روایۃ ہے کیونکہ سرقہ انعقاد اور ظہور کے لحاظ سے مکمل ہوچکا ہے اور ہبہ اور فروخت کے وقوع پذیر ہونے سے چوری کے وقت ملک قائم ہونا ظاہر نہیں ہوا تو کوئی شبہ نہ ہوگا۔ (لہذا حد ساقط نہ ہوگی)۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ حدود کے سلسلے میں حد جاری کرنا بھی حکم قضاء کا حصہ ہے کیونکہ حد کی تکمیل کے بعد حکم قاضی سے استغناء حاصل ہو جاتا ہے کیونکہ قاضی کا حکم تو اظہار کے لیے ہوتا ہے اور قطع کرنا اللہ تعالی کے حقوق سے ہے اور قطع کا ظہور قطع کے وقت ہی ہوتا ہے اور جب بات یہ ہے (اجرائے حکم قضاء کا حصہ ہے) تو قطع کے وقت تک خصومت کا قائم رہنا شرط ہوگا اور یہ صورت ایسے ہوگی کہ گویا حکم قاضی سے پہلے مالک نے مال مال مسروقہ کو چور کی ملکیت میں دے دیا۔

مسئلہ : اسی طرح اگر مال مسروقہ کی قیمت نصاب سے کم ہو جائے، اس کا معنی یہ ہے کہ حکم قاضی کے بعد اور قطع سے پہلے قیمت میں کمی آ جائے (تو قطع نہ ہوگا)۔ امام محمدؒ سے مروی ہے کہ قطع کیا جائے گا امام زفرؒ اور امام شافعیؒ کا بھی یہی قول ہے اس کو عین یعنی ذات کے نقصان پر قیاس کریں گے (مثلاً اگر کسی نے دس درہم چرائے اور ایک درہم ضائع ہوگیا تو عین کی حالت میں نقصان ہے۔ قطع لازم ہوگا)۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ نصاب کا پورا ہونا شرط کی حیثیت رکھتا ہے تو قطع ید تک اس کا پورا رہنا شرط ہوگا جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں (کہ اجزاء حد بھی حکم قضاء کا حصہ ہوتا ہے) اس کی نوعیت کسی چیز کے عین یعنی ذات میں نقصان کرنے سے مختلف ہے کیونکہ وہ چور کے ذمہ بطور قرضہ واجب ہے تو کچھ عین اور کچھ دین مل کر نصاب پورا ہو جاتا ہے جیسے کہ اگر چور پورا مال تلف کر دے تو بھی قطع لازم ہوتا ہے لیکن نرخ کی کمی کا چور ضامن نہیں ہوتا لہذا دونوں میں فرق واضح ہو گیا (یعنی نقصان عین اور بھاؤ کے گر جانے میں) .

مسئلہ : اگر چور دعوی کرے کہ مال مسروقہ اس کی اپنی ملکیت ہے تو اس سے قطع ساقط ہوگا اگرچہ وہ اپنے دعوی پر گواہ نہ لائے . اس کے معنے یہ ہیں کہ دو گواہوں نے اس کے خلاف چوری کی گواہی دی (اور اس نے بعد میں ایسا دعوی کیا) .

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ صرف دعویٰ کرنے سے حد ساقط نہ ہوگی کیونکہ کوئی چور بھی ایسا نہیں جو اتنی بات کہہ دینے سے عاجز ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حدود کا دروازہ ہی بند ہو جائے گا .

ہماری دلیل یہ ہے کہ شبہ سے حدود ساقط ہو جایا کرتی ہیں اور دعوی کرنے سے کم از کم شبہ تو پیدا ہو جائے گا کہ ممکن ہے ملزم راست گوئی سے کام لے رہا ہو .

اور جو کچھ امام شافعیؒ نے فرمایا ہے وہ قابل اعتبار نہیں ہے کیونکہ اقرار کے بعد رجوع بھی صحیح ہوتا ہے۔

مسئلہ : جب دو شخص ایک چوری کا اقرار کریں پھر ان میں سے ایک کہے کہ یہ تو میرا اپنا مال ہے دونوں پر قطع نہ ہوگا ، کیونکہ رجوع کرنے والے کے حق میں رجوع مؤثر ہوتا ہے اور دوسرے کے حق میں شبہ پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے کیونکہ چوری شرکت کی بناء پر دونوں کے اقرار سے ثابت ہوئی تھی۔

مسئلہ : اگر دو شخصوں نے چوری کی اور ان میں ایک غائب ہوگیا اور دو گواہوں نے ان دونوں کے خلاف چوری کی شہادت دی تو امام ابو حنیفہؒ کے آخری قول کے مطابق دوسرے چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اور صاحبین کی بھی یہی رائے ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کا پہلا قول یہ تھا کہ قطع نہ ہوگا کیونکہ اگر وہ حاضر ہوتا تو ممکن تھا کوئی ایسی بات کہہ دیتا جس سے شبہ پیدا ہو جاتا (اور دونوں سے حد ساقط ہو جاتی)۔ دوسرے قول کی وجہ یہ ہے کہ روپوش ہو جانا اس کے حق میں سرقہ ثابت کرنے میں مانع ہے تو وہ کالعدم رہا اور معدوم کی طرف سے کوئی شبہ پیدا نہیں ہو سکتا ہے۔ (لہذا حاضر پر حد جاری ہوگی)۔ رہا شبہ کا وہم ہونا تو یہ امر قابل اعتبار نہیں ہے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

مسئلہ : اگر محجور غلام نے اقرار کر لیا کہ اس نے وہ دس درہم بعینہ چرائے ہیں تو اس پر قطع واجب ہوگا اور وہ دس درہم مالک دراہم کو واپس کیے جائینگے ۔ (محجور غلام وہ ہوتا ہے جسے آقا کی طرف سے لین دین کرنے اور تجارت کرنے کی اجازت نہیں ہوتی) ۔ یہ امام ابو حنیفہؒ کی رائے ہے ۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ غلام پر قطع واجب ہوگا اور دس درہم آقا کو دیے جائیں گے ۔ امام محمدؒ کا ارشاد ہے کہ غلام پر قطع نہ ہوگا اور دس درہم آقا کو ملیں گے امام زفرؒ کا بھی یہی قول ہے اور اس کے معنے یہ ہیں کہ یہ حکم اس صورت میں ہے کہ جب آقا غلام کے اقرار کی تکذیب کرے ۔

مسئلہ : اگر محجور غلام ایسے مال کے چرانے کا اقرار کرے جو تلف ہو چکا ہے تو بھی اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا ۔ اور اگر غلام ماذون ہو (یعنی آقا کی طرف سے اسے لین دین یا کاروبار کی اجازت ہو) تو دونوں صورتوں میں اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا ۔ اور امام زفرؒ کا کہنا ہے کہ مذکورہ تمام صورتوں میں قطع نہیں ہوگا ۔ (یعنی غلام محجور ہو یا ماذون مال مسروقہ موجود ہو یا تلف ہوچکا ہو) کیونکہ امام زفرؒ کا اصول یہ ہے کہ غلام کا اپنی ذات پر حدود یا قصاص کا اقرار کرنا صحیح نہیں ہوتا کیونکہ اس کے اقرار سے اس کی جان یا اس کے اعضاء متاثر ہوتے ہیں حالیکہ اس کی جان اور اس کے اعضاء سب

آقا کا مال ہیں اور ایسا اقرار قابل اعتبار نہیں ہوتا جو غیر کے مال پر واقع ہو۔ البتہ اگر ماذون غلام چوری کا اقرار کرے تو مال کے تلف کی صورت میں اس پر تاوان ہوگا اور مال موجود ہونے کی صورت میں واپس کرنے کا ذمہ دار ہوگا، کیونکہ مال کے سلسلے میں اس کا اقرار صحیح ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آقا کی طرف سے اسے مالی تصرفات پر اختیار حاصل ہوتا ہے اور محجور غلام کا مال کے بارے میں بھی اقرار درست نہیں ہوتا۔

ہم کہتے ہیں اس کا اقرار اس جہت سے صحیح ہوتا ہے کہ وہ بھی ایک انسان ہے تو یہ اقرار مالیت کی طرف بھی متعدی ہو سکتا ہے تو اس سے لحاظ سے کہ یہ مال ہے اس کا اقرار درست ہوگا۔ نیز اس اقرار میں کوئی تہمت بھی نہیں کیونکہ اس اقرار میں اس کے اپنے ضرر کا پہلو ہے اور ایسا اقرار دوسرے کے لحاظ سے بھی مقبول ہو سکتا ہے۔

محجور غلام کی صورت میں امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ اس کا اقرار بالمال باطل ہوگا۔ اسی بناء پر اس کی طرف غصب کا اقرار بھی درست نہیں ہوتا اور مال آقا کی ملکیۃ میں رہتا ہے (مثلاً محجور غلام کہے کہ آقا کے پاس جو فلاں فلاں مال ہے اسے میں چھین کر لایا تھا تو اس کا اقرار درست نہ ہوگا۔ اور مال آقا کی ملکیۃ میں بحال رہے گا)۔ اور آقا کا مال چرانے میں غلام پر قطع واجب نہیں ہوتا (یعنی جب مال آقا کی ملک میں ثابت ہو گیا تو غلام جس چوری

کا اقرار کر رہا ہے وہ گویا مالک کے مال سے کی گئی لہذا قطع واجب نہ ہوگا) ۔ اور اس بات کی اس امر سے بھی تائید ہوتی ہے کہ چوری میں مال کو اصل کی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور قطع ثانوی چیز ہے حتی کہ قطع کے بغیر بھی مالی خصومت کی سماعت ہو سکتی ہے اور بغیر قطع کے مال کا ثبوت ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے بر عکس سماعت نہیں ہوا کرتی (کہ مالک یوں کہے کہ میں تو قطع کا مطالبہ کرتا ہوں مال کی واپسی کا مطالبہ نہیں کرتا) ۔ اور نہ ہی ثبوتہ ہوگا۔ تو جب اصل ہی باطل ہو جائے (یعنی مال کا ثبوتہ میسر نہ آسکے) تو تابع چیز یعنی قطع خود بخود باطل ہوجائے گا ، بخلاف ماذون غلام کے کیونکہ جو مال اس کے قبضے میں ہے اس کا اقرار کرنا صحیح ہے تو اس کے تابع یعنی قطع میں بھی صحیح ہوگا ۔

امام ابو یوسفؒ نے فرمایا کہ غلام نے در اصل دو چیزوں کا اقرار کیا ہے : اول قطع کا ، اس کا اثر اس کی اپنی ذات پر پڑتا ہے پس یہ اقرار درست ہوگا جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے ؛ دوم مال کا ، اس اقرار سے آقا متاثر ہوتا ہے. تو آقا کے حق میں صحیح نہ ہوگا اور ہاتھ کاٹنے کا استحقاق مال کے بغیر بھی صحیح ہے ۔ مثلاً ایک آزاد شخص کہے کہ جو کپڑا زید کے ہاتھ میں ہے میں نے اسے عمرو سے چرایا ہے لیکن زید کہتا ہے کہ یہ تو میرا اپنا کپڑا ہے تو اقرار کرنے والے کا ہاتھ کاٹا جائے گا اگرچہ اس کپڑے

کی تعیین کے بارے میں اس کی تصدیق نہ کی جائے گی حتی کہ وہ کپڑا زید سے لے کر عمرو کو واپس نہیں کیا جائے گا۔

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں (ان کے نزدیک اصول یہ ہے کہ سرقہ میں قطع ید اصل ہے اور مال کو ثانوی حیثیت حاصل ہے حتی کہ اگر مال چور کے پاس تلف ہوچکا ہو تو اس پر ضمان نہ ہوگی) کہ غلام کی طرف قطع کا اقرار صحیح ہوگا جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے (کہ اس کے آدمی ہونے کا اقرار صحیح ہوتا ہے) تو اسی بنا پر مال کا اقرار بھی صحیح ہوگا (کیونکہ مال کی حیثیت تابع کی ہے) کیونکہ اقرار اسی حالت سے اتصال رکھتا ہے جو باقی ہے اور مال باقی ہونے کی حالت میں قطع کے تابع ہوتا ہے۔

حتی کہ قطع کے اعتبار سے مال کی عصمت ساقط ہو جاتی ہے اور چور کے مال کو تلف کرنے کی صورت میں بھی قطع ید کی سزا کا اجراء ہوتا ہے۔ اس کی نوعیت آزاد کے مسئلے سے مختلف ہے۔ کیونکہ امانت دار کے پاس سے بھی مال چرانے پر قطع لازم ہوتا ہے۔ لیکن اگر غلام اپنے مولی کا مال چرائے تو قطع واجب نہیں ہوتا۔ پس دونوں صورتیں الگ الگ ہیں (اور آپ کا مسئلہ متنازع فیہ میں آزاد کے ساتھ نظیر پیش کرنا درست نہ رہا)۔ البتہ اگر آقا غلام کے اقرار کی تصدیق کر دے (کہ جس مال کا یہ اقرار کر رہا ہے میرا نہیں بلکہ اس نے چرایا ہے) تو مذکورہ تمام صورتوں میں غلام پر قطع لازم ہوگا۔ کیونکہ اب کوئی مانع باقی

نہیں رہا (یعنی غلام محجور ہو یا ماذون مال باقی ہو یا ضائع ہو چکا ہو) ۔

مسئلہ : اگر چور کا ہاتھ کاٹ دیا گیا اور مال مسروقہ اس کے پاس موجود ہے ، تو وہ مالک کو واپس دلایا جائے گا کیونکہ اس پر مالک کی ملکیت قائم ہے ۔ اگر مال تلف ہو چکا ہو تو چور پر ضمان نہ ہوگی اور تلف کے عموم میں دونوں صورتیں شامل ہیں کہ مال خود بخود ضائع ہو جائے یا جان بوجھ کر تلف کرے ۔ امام ابو یوسفؒ نے اسی طرح امام ابو حنیفہؒ سے روایت کیا ہے ۔ اور یہی مشہور روایت ہے ۔ امام حسنؒ نے امام ابو حنیفہؒ سے یہ روایت بیان کی ہے کہ ارادۃً تلف کرنے کی صورت میں چور ضامن ہوگا ۔

امام شافعیؒ نے فرمایا کہ دونوں صورتوں میں ضامن ہوگا ۔ کیونکہ قطع اور ضمان دو ایسے حق ہیں جن کے سبب الگ الگ ہیں تو ایک کی وجہ سے دوسرا ممتنع نہ ہوگا ۔ قطع ید تو حق شرع ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ جس چیز سے شریعت نے روکا تھا اس سے باز نہ رہا اور ضمان بندے کا حق ہے اور اس کا سبب غیر کا مال لینا ہے ۔ جیسے کہ حرم میں کسی کا مملوکہ شکاری جانور تلف کر دے (تو مالک کو قیمت بھی دینا ہوگی اور ایک قیمت جزاء کے طور پر بھی واجب ہوگی)، یا کسی ذمی کی مملوکہ شراب پی لے (تو شراب پینا الگ جرم ہے اور ذمی کی مملوکہ شے کو تلف کرنا دوسرا جرم) ۔

ہماری دلیل آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ چور کا دایاں ہاتھ کاٹنے کے بعد اس پر ضمان نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ تاوان کا واجب کرنا قطع ید کے منافی ہے کیونکہ چور تاوان ادا کرنے کی بناء پر اسی وقت سے اس کا مالک متصور ہوگا جس وقت کہ اس نے وہ چیز اٹھائی تھی، تو ثابت ہوا کہ اس کا لینا اپنی ملک سے لینا تھا، تو شبہ کی بناء پر ہاتھ کاٹنا مناسب ہی نہ رہا۔ اور جو چیز قطع ید کی نفی کا باعث بنے وہ خود منتفی ہونی چاہیے، (یعنی قطع ید تو قطعی طور پر ثابت ہو چکا ہے اگر ہم ضمان بھی واجب قرار دیں تو قطع ید باطل ہوگا، لہذا کیوں نہ ضمان کو ہی باطل قرار دیا جائے)۔ تیسری بات یہ ہے کہ مال مسروق بندے کے حق کی بناء پر معصوم و محترم نہ رہا۔ کیونکہ اگر اس کا احترام باقی تسلیم کیا جائے تو وہ بذاتہ مباح ہوگا (یعنی جو چیز کسی دوسرے کے حق کی بناء پر چور پر حرام قرار دی جاتی ہے وہ دراصل ذاتی طور پر مباح ہوا کرتی ہے۔ اگر ہم اسے مباح کہیں) تو شبہ کی بناء پر قطع ید باطل ہوگا۔ (حالیکہ یہ خلاف حقیقت ہے) تو بندے کے حق کی وجہ سے محترم نہ ہوئی بلکہ حق شرع کے مد نظر حرام ہوگی۔ جیسے مردار جانور اور جو چیز حق شرع کی بناء پر حرام ہو اس کا تاوان نہیں ہوا کرتا۔ رہی یہ بات کہ تلف کرنے کی صورت میں ضامن نہ ہوگا، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تلف کرنے کی صورت میں اس کے احترام کے سقوط کا اظہار نہیں

ہوتا ۔ کیونکہ تلف کرنا چوری سے الگ فعل ہے اور اس فعل کے حق میں ثابت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں (یعنی سقوط احترام تحقق قطع کے لیے ضروری تھا اور جو اس ضرورت کے تحت ثابت ہو وہ اسی ضرورت تک محدود ہوتا ہے اور دوسرے فعل کی طرف متعدی نہیں ہوتا ۔ دوسرے فعل سے مراد تلف کرنا ہے کیونکہ تلف نہ تو قطع کے زمرے میں داخل ہے اور نہ اس کے لوازم میں سے ہے) ۔

(اسی طرح تلف کرنے میں شبہ کا اعتبار کرنا بھی ضروری نہیں) کیونکہ شبہ کا اعتبار تو صرف سبب یعنی چوری تک محدود ہے سبب سے متجاوز نہیں ہوتا ۔ مشہور روایة (کہ استہلاک میں ضمان نہیں) کی وجہ یہ ہے کہ مال مسروق کا تلف کرنا چوری کا مقصد پورا کرنا ہوتا ہے (مثلاً روپیہ چرا کر اپنی ضروریات پوری کر لوں گا) تو اس میں شبہ معتبر ہوگا اور اسی طرح ضمان کے حق میں بھی عصمت و احترام کے ساقط ہونے کا اعتبار کیا جائے گا ۔ کیونکہ تلف کرنے سے سقوط عصمت بھی لازم آتا ہے اور تلف کرنے میں بھی تلف ہونا موجود ہوتا ہے کیونکہ مال مسروق اور تاوان میں مماثلت معدوم ہے ۔ (یعنی اگر وہ مال محترم ہو تو تلف ہونے کی صورت میں بھی محترم ہوتا ہے حالانکہ ایسا نہیں ، تو تلف کرنے اور تلف ہونے دونوں صورتوں میں محترم نہ ہوگا ، لہذا ضمان نہ ہوگی) ۔

مسئلہ : جس شخص نے کئی چوریاں کیں اور ایک چوری کے سلسلے میں اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا ۔ تو بالاتفاق

یہ سزا تمام چوریوں کی سزا ہوگی اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک کسی مال کا ضامن نہ ہوگا۔ صاحبینؒ کہتے ہیں کہ تمام چوریوں کے مال کا ضامن ہوگا۔ سوائے اس چوری کے جس کے سلسلے میں اس کا ہاتھ کاٹا گیا ہے۔ اس مسئلے کا مطلب یہ ہے کہ جن کے مال چوری ہوئے ان میں سے ایک ہی حاضر ہو۔ اگر تمام مالک موجود ہوں اور ان کی خصومت کی بناء پر ہاتھ کاٹا گیا تو بالاتفاق وہ تمام چوریوں کے سلسلے میں کسی مال کا بھی ضامن نہ ہوگا۔

صاحبینؒ کی دلیل یہ ہے کہ حاضر شخص غائب کی طرف سے نائب نہیں اور خصومت کا ہونا ضروری ہے تاکہ سرقہ کا اظہار ہو سکے۔ لیکن غائب مالکوں کی طرف سے سرقہ کا اظہار نہ ہوگا، تو چور کا ہاتھ ان کی چوریوں کی وجہ سے نہیں کاٹا جائے گا۔ تو ان کے اموال محترم و معصوم رہے۔ (اور مال معصوم کی ضمان ہوتی ہے)۔

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ تمام چوریوں کی طرف سے حق شرع کے مد نظر ایک ہی قطع واجب ہے۔ کیونکہ حدود تداخل پر مبنی ہوتی ہیں اور خصومت کا مقصد یہ ہے کہ قاضی کے نزدیک چوری ظاہر ہو جائے اور قطع ید جرم کے ارتکاب کی بناء پر ہے۔ جب ایک بار ہاتھ کٹ گیا تو مکمل واجب سزا یہی تھی جو پوری کر دی گئی۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ سزا کا فائدہ سب کو پہنچے گا؟ (کہ اسے سب چوریوں سے تنبیہ ہو جائے گی) تو سزا بھی سب کی طرف سے

ہوگی اور یہی اختلاف اس میں بھی ہے جب کہ چوریوں کے تمام نصاب ایک ہی شخص سے تعلق رکھتے ہوں (یعنی ایک ہی شخص کی بار بار چوری کرے اور ہر بار چوری کا نصاب مکمل ہو یعنی کم از کم دس درہم ہوں) اور وہ چند بار کی چوری کا مطالبہ کرکے ہاتھ کٹوائے۔ (تو صاحبینؒ کے نزدیک جو چوریاں مطالبے سے بچ رہی ہیں ان کا ضامن ہوگا اور امام کے نزدیک کسی کا بھی ضامن نہیں)۔

بَابُ مَا يَحْدِثُ السَّارِقُ فِي السَّرِقَةِ

مال سرقه میں چور کے تغیر کرنے کے بیان میں

مسئلہ: جس شخص نے کپڑا چرایا اور اسی گھر میں اس کے دو ٹکڑے کرکے باہر نکالا ، حالیکہ اس کی قیمت دس درہم کے برابر ہے تو چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا . امام ابو یوسفؒ سے روایت ہے کہ ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا . کیونکہ اس کپڑے میں چور کی ملکیت کا ایک سبب پیدا ہوگیا اور وہ پھاڑ کر دو ٹکڑے کر دینا ہے کیونکہ پھاڑنے سے اس پر قیمت واجب ہو جاتی ہے اور کپڑا اس کی ملکیت میں آ جاتا ہے . اس کی نظیر اس خریدار کی ہوگی جو اس مبیع (یعنی فروخت کی جانے والی چیز) کو چرالے جس میں بائع کو خیار حاصل ہے (کہ تین دن کے اندر اندر چاہے تو فروخت کرے یا سودا منسوخ کر دے) (تو ایسی صورت میں مشتری کا ہاتھ نہ کاٹا جائے گا) .

امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کی دلیل یہ ہے کہ مال کا لے لینا وجوب ضمان کا سبب ہوتا ہے ، ملک کا سبب نہیں ہوتا ، البتہ ادائے تاوان کی صورت میں ملک ضرورت کے تحت ثابت ہوتا ہے . تاکہ دونوں معاوضے ایک ملک

میں اکھٹے نہ ہو جائیں (یعنی مالک مسروق چیز بھی لے اور ضمان بھی لے تو اس طرح اصل اور بدل دونوں کا اجتماع ہو جاتا ہے) اور اس جیسا لینا (جو ضمان کا سبب بنتا ہے) شبہ پیدا نہیں کرتا. جس طرح صرف لینا شبہ پیدا نہیں کرتا یا جیسے بائع کوئی عیب دار چیز فروخت کرنے کے بعد مشتری کے ہاں سے چرا لے (تو بائع کا ہاتھ کاٹا جائے گا. اگرچہ عیب کی بناء پر وہ چیز خود ہی واپسی کے قابل تھی) . یہ صورت اس صورت کے خلاف ہے جس کا ذکر امام ابو یوسفؒ نے کیا ہے (یعنی خیار بائع کی صورت) ، کیونکہ بیع کا مقصد یہ ہے کہ اس سے ملکیت حاصل ہو جائے.

یہ اختلاف اس صورت میں ہے کہ جب مالک پھاڑنے کے نقصان کا معاوضہ اور کپڑا لینے پر رضا مند ہو. اگر مالک قیمت لے کر کپڑا چور کے پاس رہنے دے تو بالاتفاق چور پر قطع نہ ہوگا. کیونکہ اس صورت میں وہ اٹھانے کے وقت سے کپڑے کا مالک ہوگا ، پس گویا وہ مالک کے ہبہ کی بناء پر کپڑے کا مالک بن گیا لہذا ایک شبہ پیدا ہوگیا (اور شبہ سے حد ساقط ہو جاتی ہے) . یہ تمام اختلافات اس صورت میں ہیں جب کہ نقصان بالکل واضح اور کثیر ہو. اگر نقصان تھوڑا ہو تو بالاتفاق قطع کیا جائے گا. کیونکہ اس صورت میں ملک کا سبب نہیں پایا جاتا اس کی وجہ یہ ہے کہ اب چور کو پوری قیمت بطور تاوان دینے کا اختیار نہیں ہے.

مسئلہ : اگر چور نے بکری چرائی اور وہیں ذبح کرکے باہر نکلی تو قطع نہ ہوگا ۔ کیونکہ چوری گوشت کی صورت میں تکمیل پذیر ہوئی ہے اور گوشت چرانے میں قطع ید نہیں ہوتا ۔

مسئلہ : جس شخص نے ایسے سونے یا چاندی کی چوری کی جس میں قطع واجب ہوتا ہے ۔ پھر اس کے دینار یا درہم بنا لیے تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا اور دینار یا درہم مسروق منہ کو واپس کر دیے جائیں گے ۔ یہ امام ابو حنیفہؒ کی رائے ہے ۔ صاحبین کا کہنا ہے کہ مسروق منہ کو درہم و دینار واپس کرنے کی کوئی صورت نہیں ۔ اس مسئلہ کا اصل ”کتاب الغصب“ میں مذکور ہے ۔ صاحبین کے نزدیک درہم و دینار بنانے کی صنعت قیمتی امر ہے ، مگر امام کے نزدیک نہیں ۔ لہذا امام کے نزدیک سزائے قطع واجب ہونے میں کوئی اشکال نہیں ہے ۔ کیونکہ چور مال مسروقہ کا مالک نہ ہوگا ۔ صاحبین کے قول پر بعض علماء نے کہا کہ سزائے قطع واجب نہ ہوگی ۔ کیونکہ قطع سے پہلے مال مسروقہ کو درہم و دینار میں تبدیل کرلینے سے وہ اس مال کا مالک ہو گیا ۔ اور بعض نے کہا کہ قطع واجب ہوگا ۔ کیونکہ صنعت کی بناء پر مال مسروقہ کی نوعیت ہی بدل گئی تو وہ بعینہ مال مسروقہ کا مالک نہ ہوا ۔

مسئلہ : اگر چور نے کپڑا چرایا اور اسے سرخ رنگ میں رنگ لیا تو اس پر قطع واجب ہوگا ۔ نہ تو اس سے کپڑا

واپس لیاجائے گا اور نہ ہی وہ کپڑے کی قیمت کا ضامن ہوگا .
یہ امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کی رائے ہے . امام محمدؒ
فرماتے ہیں کہ اس سے کپڑا لے لیا جائے گا اور رنگائی کا معاوضہ
اسے دے دیا جائے گا ، جیسا کہ غصب کی صورت میں ہوتا
ہے (اگر کسی کا کپڑا چھین کر سرخ رنگ میں رنگ لے تو
کپڑا واپس لیا جائے گا اور رنگائی کا معاوضہ دیا جائے گا) .
ان دونوں میں جامع علة یہ ہے کہ جو چیز اصل ہے یعنی
کپڑا وہ قائم ہے اور رنگائی کو تابع کی حیثیت حاصل ہے .

شیخین فرمائے ہیں کہ رنگ ظاہراً ومعناً قائم ہے حتی
کہ اگر رنگا ہوا کپڑا لینا چاہا تو رنگ کے معاوضے کا ضامن
ہوگا اور مالک کا حق کپڑے میں صورةً تو قائم ہے ، مگر
معنی قائم نہیں رہا . کیا آپ دیکھتے نہیں کہ اگر وہ چور کے
پاس ضائع ہو جائے تو وہ اس کا ضامن نہ ہوگا ؟ پس ہم نے
(مالک اور چور کے حق کی جانب نظر کرتے ہوئے) جانب
چور کو ترجیح دی (کیونکہ جو چیز صورةً و معنی قائم
ہے اسے اس پر ترجیح حاصل ہوگی جو صرف صورةً قائم ہے) .
چھین لینے کی صورت اس سے مختلف ہے کیونکہ مالک اور
غاصب دونوں کا حق صورةً اور معنیً قائم ہے تو اس لحاظ
سے دونوں برابر ہوں گے . لیکن ہم نے جانب مالک کو
ترجیح دی جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں (کہ کپڑے کو
اصل کی حیثیت حاصل ہے) .

اگر چور نے اسے سیاہ رنگ میں رنگا ہو تو دونوں

اماموں یعنی امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک کپڑا اس سے لے لیا جائے گا۔ اور امام ابو یوسفؒ کی رائے میں سرخ رنگ یا سیاہ رنگ میں کوئی فرق نہیں کیونکہ سرخ رنگ کی طرح سیاہ رنگ بھی کپڑے پر اضافہ ہے اور امام کے نزدیک بھی اگرچہ سیاہی بھی سرخی کی طرح اضافے کا حکم رکھتی ہے لیکن اس سے مالک کا حق منقطع نہیں ہوتا (کیونکہ رنگ تابع کی حیثیت رکھتا ہے)۔ اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک سیاہی ایک طرح کا نقصان ہے جس سے مالک کا حق منقطع نہ ہوگا۔ (علماء نے کہا ہے کہ یہ اختلاف اپنے اپنے زمانے کے لحاظ سے ہے۔ امام کا زمانہ بنو امیہ کے عہدِ حکومت کا زمانہ تھا جس میں سرخ رنگ کی قدر تھی اور سیاہی عیب تھی اور صاحبینؒ کا زمانہ بنو عباس کا دور تھا جس میں سیاہ رنگ کی قدر تھی)۔

وَاللّٰہُ اَعْلَمُ

بَابُ قَطْعِ الطَّرِيقِ

رہزنی کے بیان میں

(فقہائے کرام نے رہزنی کی چند شرائط بیان کی ہیں :
اول : رہزن ایسے لوگ ہوں جن کو ایسی قوت و شوکت
حاصل ہو کہ راہ چلنے والوں میں ان کے مقابلے کی سکت نہ
ہو ؛ دوم : وہ لوگ اسلحہ کے ساتھ مسلح ہوں یا لاٹھیاں
وغیرہ لیے ہوں ؛ سوم : مقام رہزنی شہر سے دور باہر ہو ؛
چہارم : رہزنی کا واقعہ دارالاسلام میں پیش آئے ؛ پنجم : جو
مال انھوں نے لوٹا ہے وہ اس قدر ہو کہ جس پر جزائے سرقہ
لازم آتی ہے ؛ ششم : رہزن مسافروں کے لیے اجنبی ہوں .
اگر کسی مسافر کا کوئی رشتہ دار ہوا تو رہزنوں پر سزا
واجب نہ ہوگی ؛ ہفتم : رہزنوں کو توبہ کرنے سے پہلے
گرفتار کر لیا جائے) .

مسئلہ : امام قدوری نے فرمایا کہ ایک جماعت جس
کے افراد کو امتناعی قدرت حاصل ہے یا ایک شخص جس
کو امتناعی قوت حاصل ہے (یعنی مقابلہ کرکے دوسروں
کے ضرر کو روک سکتے ہیں) رہزنی کے ارادے سے نکلیں اس
سے قبل کہ کسی کا مال چھین لیں یا کسی کو قتل کریں

گرفتار کر لیے جائیں تو امام ان کو قید میں ڈال دے یہاں تک کہ یہ لوگ توبہ کرلیں ۔

اگر وہ کسی مسلمان یا ذمی کا مال لوٹ چکے ہوں اور لوٹے ہوئے مال کی مقدار اتنی ہو کہ جب وہ مال اس جماعت کے افراد پر تقسیم کیا جائے تو ہر ایک کے حصے میں دس دس درہم یا اس سے زائد آ جائیں ، یا ایسی چیز ہو کہ جس کی قیمت اس مقدار کو پہنچ جاتی ہو ، تو امام ان کے دائیں ہاتھ اور بائیں پاؤں کاٹ دے ۔ اگر انھوں نے قتل کیا ہو اور مال نہ لوٹا ہو تو امام ان کو قصاص میں قتل کر ڈالے اور اس باب میں اصل اللہ تعالی کا یہ ارشاد گرامی ہے :

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْھِمْ وَاَرْجُلُھُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ (المائدة : ۳۳) : یعنی جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لیے تگ و دو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں ، ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کیے جائیں یا سولی پر چڑھائے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں یا وہ جلا وطن کر دیے جائیں ۔ اس آیت سے مراد (اللہ تعالی بہت بہتر جانتے ہیں) یہ ہے کہ یہ سزا مختلف حالات میں منقسم ہوگی (یعنی ہر حالت کے مناسب ایک سزا ہے) . تین حالتیں تو وہی ہیں جو ہم نے ذکر کی ہیں اور چوتھی صورت کا (جب کہ وہ قتل بھی کریں اور مال بھی لوٹ لیں) ذکر إن شاء اللہ آیندہ سطور میں

بیان کیا جائے گا. دوسری بات یہ ہے کہ گناہوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے سزاؤں میں بھی تفاوت ہوتا ہے، بڑے جرم کی سزا بھی بہت سخت ہوگی.

پہلی صورت میں سزا قید کرنا ہے کیونکہ آیت میں نفی مذکور سے مراد یہ ہے کہ اسے قید میں ڈال کر روئے زمین سے نفی کر دیا جائے. تاکہ اہل زمین سے ان کا اثر دور کیا جا سکے اور رہزنوں پر تعزیر بھی جاری کی جائے گی، کیونکہ انہوں نے لوگوں کو ڈرانے کے ممنوع فعل کا ارتکاب کیا ہے.

امام قدوری نے رہزنوں کے لیے شرط امتناع بھی عائد کی ہے. کیونکہ جب تک یہ قوت و شوکت حاصل نہ ہوگی مقابلہ و جنگ ممکن نہیں ہوتی. اور دوسری صورت کا (کہ جب مال لوٹیں اور قتل نہ کریں) حکم وہی ہے جو ہم نے بیان کیا ہے کیونکہ مذکورہ بالا آیت میں یہی حکم ہے.

امام قدوری نے یہ شرط بھی لگائی ہے کہ مال مسلمان کا ہو یا ذمی کا. یہ شرط اس لیے ہے کہ ہر ایک کے مال کو دائمی عصمت و حفاظت ہو. (مسلم اور ذمی کی شرط لگانے کی بناء پر) اگر حربی امان حاصل کرکے دارالاسلام میں آیا اور رہزنی کا واقعہ اس کے ساتھ پیش آگیا تو قطع واجب نہ ہوگا.

امام قدوری نے تیسری شرط ہر ایک کے لیے کمال نصاب کی لگائی ہے. تاکہ اس کے ہاتھ پاؤں کا قطع کرنا

مباح نہ ہو جب تک قدر و قیمت کی کوئی چیز نہ لوٹے (یعنی اگر مقدار نصاب سے کم لوٹا ہو تو قطع واجب نہ ہوگا) ۔

قطع سے مراد دائیں ہاتھ اور بائیں پاؤں کا کاٹنا ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ جنس منفعت ہی جاتی رہے (یعنی کسی حد تک اپنی ضروریات پورا کرنے کے قابل رہے) ۔

تیسری صورت (جب قتل کریں اور مال نہ لوٹیں) کا حکم وہی ہے جس کا ہم نے ذکر کیا ہے ۔ قرآن کریم کی مذکورہ آیت میں بھی یہی مذکور ہے ۔

قاتل رہزن سزا کے طور پر قتل کیے جائیں گے حتی کہ اگر مقتولین کے وارث معافی بھی دے دیں تو ان کے معاف کرنے کی طرف کوئی التفات نہ کیا جائے گا ، کیونکہ یہ حق شرع ہے (اور حق شرع کسی انسان کے معاف کردینے سے معاف نہیں ہوا کرتا) ۔

رہزن جب قتل کا ارتکاب بھی کریں اور اموال بھی لوٹیں تو امام کو سزا میں اختیار ہے کہ پہلے مخالف سمتوں سے ہاتھ اور پاؤں کاٹے اور بعد میں قتل کرے یا سولی پر چڑھا دے یا چاہے تو صرف قتل کرے یا سولی پر لٹکائے ۔ امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ قتل کرے یا سولی دے ۔ لیکن ان کے ہاتھ پاؤں نہ کاٹے جائیں کیونکہ رہزنی ایک ہی جنایۃ ہے لہذا دو حدیں واجب نہ ہوں گی ۔ دوسری بات یہ ہے کہ حدود کے باب میں قتل نفس کی سزا کی صورت میں اس سے کم سزا بھی اس میں شامل ہوتی ہے (لہذا ہاتھ پاؤں کاٹنے کی

ضرورت نہیں) جیسا کہ حد سرقہ اور رجم کی صورت میں ہوتا ہے (کہ ایک شخص نے چوری اور زناء دونوں کا ارتکاب کیا ، تو سزا میں یہ نہ ہوگا کہ پہلے ہاتھ کاٹا جائے اور پھر رجم کیا جائے بلکہ رجم ہی میں چوری کی سزا بھی داخل ہو جائے گی) .

شیخین کہتے ہیں کہ ہاتھ کاٹ کر قتل کرنا یا سولی دینا ایک ہی سزا شمار ہوگی اور سزا کی شدت کا سبب جرم کی شدت ہے . کیونکہ رہزنوں نے دو بڑے ممنوع جرموں کا ارتکاب کیا ہے ، یعنی لوگوں کو قتل کیا اور ان کے اموال لوٹے ، لہذا یہ نقض امن کی انتہائی صورت ہے (جس کی سزا بھی شدید ہونی چاہیے . اسی بناء پر رہزنی میں ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کا ساتھ ساتھ کاٹنا ایک ہی سزا شمار کی جاتی ہے اور اگر یہ عام چوری میں ہوں تو دو حدیں ہیں اور تداخل تو مختلف حدوں میں ہوتا ہے نہ کہ ایک ہی حد میں) .

امام قدوری نے سولی دینے اور نہ دینے میں تخییر کا ذکر کیا ہے اور یہی ظاہر الروایۃ بھی ہے . امام ابو یوسف سے مروی ہے کہ سولی کا ترک جائز نہیں . کیونکہ اس کا حکم نص میں موجود ہے . نیز اس سزا کا مقصد تشہیر ہے تاکہ لوگوں کے لیے سامان عبرت ہو .

ہم کہتے ہیں کہ اصل تشہیر تو قتل سے ہوتی ہے اور سولی دینا تو سزا میں مبالغے کا حکم رکھتا ہے پس امام

کو اختیار حاصل ہوگا۔

مسئلہ : امام قدوری ؒ نے فرمایا کہ رہزن کو زندہ ہی سولی پر لٹکایا جائے اور نیزہ مار کر اس کا پیٹ چاک کر دیا جائے حتی کہ مر جائے۔ امام کرخی ؒ سے بھی ایسے ہی مروی ہے۔ امام طحاوی ؒ فرماتے ہیں کہ اسے قتل کرکے صلیب پر لٹکایا جائے تا کہ مثلہ ہونے سے احتراز کیا جاسکے۔ پہلے قول کی وجہ یہ ہے اور یہی صحیح بھی ہے کہ متن میں مذکورہ صورت کے مطابق صلیب پر چڑھانا زیادہ خوف ناک عبرت کا باعث ہے اور سزا کا مقصد بھی یہی ہے۔

مسئلہ : امام قدوری ؒ نے فرمایا کہ تین دن سے زیادہ صلیب پر نہ لٹکایا جائے۔ کیونکہ اس مدت کے بعد لاش بدبو دار ہو جاتی ہے اور لوگوں کی تکلیف کا باعث ہوتی ہے۔ امام ابو یوسف ؒ فرماتے ہیں کہ سولی پر چھوڑ دیا جائے۔ تاکہ ریزہ ریزہ ہو کر اس کا جسم گرتا رہے اور لوگوں کی عبرت کا سامان بنتا رہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہماری ذکر کردہ صورت میں سامان عبرت پورے طور پر موجود ہے اور یہ آخری انتہاء مطلوب نہیں ہے۔

مسئلہ : امام قدوری ؒ نے فرمایا کہ جب رہزن کو قتل کی سزا دے دی گئی تو اس پر اس مال کی ضمان نہ ہوگی جو اس نے لوٹا ہے۔ جیسا کہ سرقۂ صغری کی صورت میں ہوتا ہے اور یہ بات بیان کی جا چکی ہے۔

اگر رہزنوں میں سے کسی ایک نے قتل کا ارتکاب کیا

لیکن سزائے قتل سب پر جاری ہوگی ۔ کیونکہ یہ قتل محاربہ کی سزا ہے اور محاربہ اسی صورت میں متحقق ہوتا ہے کہ جب بعض لڑ رہے ہوں اور بعض ان کی اعانت کے لیے کمر بستہ ہوں ، حتی کہ اگر ان کے قدم اکھڑنے لگیں تو دوسرے ان کے ساتھ شریک ہو جائیں اور شرط یہی ہے کہ ان میں کوئی ایک ہی قتل کا ارتکاب کرے اور یہ بات پائی گئی ہے ۔

مسئلہ : امام قدوریؒ نے فرمایا کہ قتل خواہ لاٹھی سے ہو یا پتھر سے یا تلوار سے کوئی فرق نہیں ، کیونکہ مسافروں کی راہ مارنے سے رہزنی کا تحقق پایا جاتا ہے ۔

اگر رہزن نہ تو قتل کرے اور نہ مال لوٹے لیکن زخمی کرے تو جن زخموں میں قصاص ہوتا ہے ان میں قصاص لیا جائے گا اور جن زخموں میں مالی تاوان ہوتا ہے ان میں مالی تاوان لیا جائے گا ۔ اور یہ حق مجروح کے اولیاء کو حاصل ہوگا ، کیونکہ اس قسم کے جرم میں شریعۃ کی طرف سے کوئی حد مقرر نہیں ہے ۔ پس بندے کا حق ظاہر ہوگا ۔ یعنی قصاص یا تاوان اور اسے وصول کرنے کا حق اولیاء کو ہوگا ۔

اگر رہزن مال لوٹنے کے بعد زخمی کرے تو اس کا ہاتھ اور پاؤں مخالف سمت سے کاٹا جائے گا اور زخموں کی حد یا تاوان ساقط ہوگا ۔ کیونکہ جب حق شرع کے مد نظر حد واجب ہوگئی تو بندے کے حق کے مد نظر نفس کی عصمت ساقط ہوگئی ۔ جس طرح کہ حد سرقہ کی صورت میں مال کی عصمت ساقط ہو جاتی ہے ۔

اگر توبہ کرنے کے بعد گرفتار ہو اور اس نے عمداً قتل کیا ہو تو مقتول کے وارثوں کو اختیار ہے ، چاہیں تو اس سے قصاص لے سکتے ہیں یا معاف کر سکتے ہیں ۔ کیونکہ اس جرم کی حد توبہ کے بعد جاری نہیں کی جاتی ۔ اس لیے کہ نص قرآنی میں یہ استثناء موجود ہے ۔

نیز توبہ کی صحت مال کی واپسی پر ہے اور ایسی صورتوں میں قطع نہیں کیا جاتا (یعنی جب مال واپس کر دیا جائے تو خصومت منقطع ہو جاتی ہے) اور بندے کا حق نفس اور مال میں ثابت ہو جاتا ہے ، حتی کہ ولی کو قصاص لینے یا معاف کر دینے کا اختیار ہوتا ہے ۔ اگر رہزن کے پاس مال تلف ہو جائے یا خود تلف کرے تو دونوں صورتوں میں اس پر ضمان ہوگی ۔

مسئلہ : امام قدوریؒ نے فرمایا کہ رہزنوں میں اگر کوئی بچہ ہو یا مجنون ہو یا جن کو لوٹا گیا ہے ان میں سے کسی کا ذو محرم رشتہ دار ہو تو سب سے حد ساقط ہو جائے گی ۔ طفل اور مجنون کے بارے میں امام ابو حنیفہؒ اور امام زفرؒ کا قول مذکور ہے ۔ اور امام ابو یوسفؒ کا ارشاد ہے کہ اگر رہزنی کا ارتکاب عقلاء نے کیا ہو تو طفل اور مجنون کے سوا باقی سب کو سزا دی جائے گی ۔ سرقۂ صغری یا چوری میں بھی امام ابو یوسفؒ کے نزدیک یہی حکم ہوگا ۔ (کہ طفل اور مجنون کے علاوہ دوسرے چوروں کے ہاتھ کاٹے جائیں گے) کیونکہ جرم کا ارتکاب کرنے والا اصل

ہے اور اس کی مدد کرنے والے تابع ہیں اور عاقل کے ارتکاب جرم میں کوئی خلل نہیں ہے اور تابع کے ارتکاب میں اگرچہ خلل ہے لیکن وہ قابل اعتبار نہ ہوگا۔ (لہذا اگر تابع سے حد ساقط بھی ہوگئی تو اصل سے ساقط نہ ہوگی)۔ اگر یہ صورت اس کے برعکس ہو تو حکم بھی بدل جائے گا۔ (یعنی اگر غیر عقلاء جرم کا ارتکاب کریں اور عقلاء تابع کی حیثیت میں ہوں تو اس صورت میں اصل میں خلل پایا جاتا ہے لہذا سب سے حد ساقط ہوگی)۔

امام ابو حنیفہؒ اور امام زفرؒ کی دلیل یہ ہے کہ یہ رہزنی جرم واحد ہے جس کا تعلق پورے گروہ سے ہے، تو جب بعض کا فعل موجب حد نہ ہوا تو باقیوں کے فعل میں مکمل علة اور سبب موجود نہ ہوا اور ایسی ناقص علة سے حکم ثابت نہیں ہوا کرتا، تو اس کی نظیر یہ ہوگی کہ جس طرح عمداً فعل کرنے والے کے ساتھ ایک خطاء کرنے والا شریک ہو جائے (مثلاً ایک شخص نے آدمی کو پہچان کر قصداً گولی چلائی اور دوسرے نے شکار کا جانور سمجھ کر گولی داغ دی اور وہ آدمی مر گیا تو علة کے ناقص ہونے کی بناء پر عمداً گولی مارنے والا بھی سزا سے بچ جائے گا)۔

ذو رحم محرم کی صورت میں ابوبکر رازیؒ کا کہنا ہے: اس کی تاویل یہ ہے کہ جن پر رہزنی ہوئی ہو۔ ان کے مال باہم مشترک ہوں مگر صحیح صورت یہ ہے کہ حکم مطلق ہے۔ یعنی مال مشترک ہو یا نہ ہو حد ساقط ہوگی کیونکہ

جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں جرم واحد ہے۔ جب بعض کے حق میں حد ممتنع ہوگئی تو باقیوں کے حق میں بھی ممتنع ہوگی۔ بخلاف اس صورت کے کہ جب مسافروں میں کوئی امان لے کر آنے والا حربی بھی ہو کیونکہ اس کے حق میں رہزنوں سے سزا ساقط ہونا اس بناء پر ہے کہ اس کے مال کی عصمت میں خلل ہے اور یہ خلل عصمت حربی ہی سے مخصوص ہوگا اور اس صورت میں حد کا ممتنع ہونا اس وجہ سے ہے کہ حرز و حفاظت میں خلل ہے اور پورا ایک ہی حرز ہے۔ (یعنی پورا قافلہ ایک مقام محفوظ ہے)۔

جب حد ساقط ہوگئی تو قتل کا قصاص اولیاء کے اختیار میں ہے، کیونکہ جب شرع کا حق جاتا رہا تو بندے کا حق ثابت ہو جائے گا۔ جیسا کہ ہم مذکورہ بالا سطور میں بیان کر چکے ہیں۔ اولیاء اگر چاہیں تو قتل کا قصاص لیں اور اگر چاہیں تو معاف کر دیں۔ اگر ایک قافلہ میں بعض نے بعض پر رہزنی کی تو رہزنوں پر حد واجب نہ ہوگی، کیونکہ حرز واحد ہے لہذا پورا قافلہ ایک گھر کی طرح ہوگا۔ (اور اگر گھر کے رہنے والوں سے کوئی چوری کرے تو حد واجب نہیں ہوتی)۔

مسئلہ : اگر کسی شخص نے دن کے وقت یا رات کے دوران شہر میں یا کوفہ اور حیرہ کے درمیان (جن میں ایک میل کا فاصلہ) رہزنی کی تو استحسان کے مد نظر اسے رہزنی نہیں کہا جائے گا۔ قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ اسے رہزنی

ہی شمار کیا جائے گا۔ اور امام شافعیؒ کا بھی یہی قول ہے کیونکہ حقیقةً رہزنی موجود ہے۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ اگر شہر سے باہر رہزنی کا واقعہ پیش آئے تو سزائے قطع واجب ہوگی۔ اگرچہ شہر کے قرب و جوار ہی میں یہ واقعہ کیوں نہ پیش آیا ہو کیونکہ شہر سے باہر بروقت مدد نہیں پہنچ سکتی۔

امام ابو یوسفؒ سے یہ روایت بھی ہے کہ اگر دن کے وقت اسلحہ سے لڑیں یا رات کے وقت اسلحہ یا لاٹھیوں سے لڑیں تو یہ لوگ رہزن ہی ہوں گے۔ کیونکہ ہتھیاروں کی صورت میں اتنی دیر نہیں لگتی اور رات کے وقت مدد پہنچنے میں دیر لگتی ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ مسافروں کا راہ مارنا رہزنی کہلاتا ہے اور یہ بات شہر میں یا شہر کے قرب و جوار میں متحقق نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ شہر یا قرب و جوار میں مدد فوری طور پر پہنچ سکتی ہے۔ لیکن شہر میں ایسا فعل کرنے سے انہیں گرفتار اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ متحقق مالکوں کا مال واپس کیا جا سکے اور مجرموں کو تعزیر دی جا سکے، اور قید میں اس لیے رکھے جاتے ہیں کہ انہوں نے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ اگر وہ قتل کا ارتکاب کریں تو مقتول کے اولیاء کو اختیار ہوگا جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔

مسئلہ: اگر کسی کا گلا گھونٹ کر اسے مار ڈالا تو امام ابو حنیفہؒ کی رائے میں مقتول کی دیۃ قاتل کی مددگار

برادری پر ہوگی اور یہ بھاری چیز کے ساتھ قتل کرنے کا مسئلہ ہے۔ اور اس کی تفصیل ہم إن شاء اللہ "باب الدیات" میں بیان کریں گے اور اگر کسی شخص نے شہر میں گلا گھونٹنے کا جرم کئی بار کیا تو اسے قتل کیا جائے گا۔ کیونکہ وہ ملک میں فساد پھیلانے والا ہے تو قتل کر کے اس کا شر اور فتنہ و فساد دور کیا جائے گا۔

وَاللهُ أَعْلَمُ

كِتَابُ السِّيَرِ

سیر کے بیان میں

سیر، سیرۃ کی جمع ہے اور کاموں میں ایک خاص طریق کو سیرۃ کہا جاتا ہے اور شریعۃ میں سیرۃ کا تعلق نبی اکرم ﷺ کے اس طریق سے ہے جو آپ نے جہاد میں اختیار فرمایا.

مسئلہ : امام قدوریؒ نے فرمایا کہ جہاد فرض کفایہ ہے. اگر بعض نے اس فریضہ کی اقامۃ و ادائیگی کر دی، تو باقیوں سے اس کی فرضیۃ ساقط ہو جائے گی. فرضیت جہاد کی دلیل اللہ تعالی کا یہ ارشاد گرامی : فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً (التوبة : ۳۳) : یعنی مشرکوں سے سب مل کر لڑو جس طرح وہ سب مل کر تم سے لڑتے ہیں). نیز نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جہاد قیامت تک جاری رہے گا. اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جہاد کی فرضیت قیامت تک باقی ہے (یہ مطلب نہیں کہ لوگ قیامت تک لڑتے ہی رہیں گے).

جہاد فرض کفایہ ہے کیونکہ بالذات فرض نہیں اس واسطے کہ اپنی ذات کے لحاظ سے تو افساد ہے اور فرض اس

لیے ہے تاکہ اللہ تعالی کے دین متین کو اعزاز و سربلندی حاصل ہو اور لوگوں سے شرک و بدعت اور فتنہ و فساد کا ازالہ کیا جا سکے، تو جب بعض کے جہاد میں شامل ہونے سے مقصد حاصل ہو جائے گا تو فریضہ باقی لوگوں سے ساقط ہو جائے گا ۔ جیسا کہ نماز جنازہ اور سلام کا جواب دینا (اگر بعض آدمی نماز جنازہ میں شریک ہو جائیں یا بعض لوگ سلام کا جواب دے دیں تو باقی لوگوں سے ساقط ہو جائے گا) ۔

مسئلہ : اگر فریضۂ جہاد سے سب غافل ہو جائیں تو اس کے ترک پر سب گناہگار ہوں گے ۔ کیونکہ اس کا واجب ہونا سب کے لیے برابر تھا ۔ فرض کفایہ ہونے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر تمام لوگ جہاد میں مشغول ہو جائیں تو جہاد کے اسباب یعنی اسلحہ اور گھوڑوں وغیرہ کا سلسلہ منقطع ہو جائے ۔ اس لیے واجب علی الکفایة ہے (یعنی اگر خورد و کلان سب جہاد میں مشغول ہو جائیں تو اسلحہ کون بنائے گا اور سواریوں کی دیکھ بھال کون کرے گا) ۔ ہاں اگر اعلان عام ہو جائے تو اس صورت میں جہاد فرض عین ہو جائے گا ۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے : **اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ** (التوبة : ۴۱) : نکلو خواہ ہلکے ہو یا بوجھل اور جہاد کرو اللہ تعالی کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ ۔

مسئلہ : امام محمدؒ نے ''الجامع الصغیر'' میں فرمایا کہ جہاد واجب ہے البتہ مسلمانوں کو گنجائش ہے ، یعنی جب تک کہ ضرورت پیش نہ آئے . جامع صغیر کے ابتدائی کلام کا معنی یہ ہے کہ جہاد فرض کفایہ ہے اور فقرے کے آخری حصے کا مقصد نفیر عام ہے (یعنی جب ضرورت پیش آجائے اور جہاد کا اعلان عام ہو جائے تو سب پر فرض ہوگا) . کیونکہ اعلان عام کی صورت میں سب کے شرکت کرنے کے بغیر مقصد کا حصول ممکن نہیں لہذا سب پر فرض ہوگا۔

مسئلہ : کفار کا قتل کرنا واجب ہے اگرچہ کافر لوگ پیش قدمی نہ کریں ، (کیونکہ جہاد کا مقصد اصلی اعلاء کلمۃ اللہ ہے) . بچے پر جہاد واجب نہ ہوگا کیونکہ وہ محل رحمت ہے . غلام اور عورت پر بھی واجب نہیں کیونکہ آقا اور خاوند کے حقوق مقدم ہیں . اندھے، لنگڑے اور پاؤں کٹے پر بھی واجب نہیں کیونکہ یہ لوگ عاجز ہیں .

اگر دشمن کسی شہر پر حملہ کر دیں تو تمام لوگوں پر مدافعت واجب ہوگی ، حتی کہ عورت بھی خاوند کی اجازت کے بغیر اور غلام آقا کی اجازت کے بغیر شریک ہوسکیں گے . کیونکہ جہاد فرض عین ہوگیا ہے اور ملک رقبہ اور ملک نکاح فرض عین کے مزاحم نہیں ہو سکتا . جیسے نماز اور روزے میں (غلام کو آقا کی اور بیوی کو خاوند کی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی) . لیکن جب اعلان عام نہ ہو (تو انہیں اجازت کی ضرورت در پیش ہوگی) کیونکہ ان کے

بغیر بھی کفایة حاصل ہے یعنی کام چلایا جا سکتا ہے اور آقا اور شوہر کا حق باطل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ۔

مسئله : جب تک بیت المال میں مال موجود ہے مسلمانوں کے لیے جہاد کا معاوضہ لینا جائز نہیں ہے ، کیونکہ یہ مزدوری کے مشابہ ہوگا اور اس کی کوئی ضرورت نہیں ۔ اس لیے کہ بیت المال کا مقصد یہی ہے کہ حوادثات کے وقت مسلمانوں کے کام آئے ۔

اگر بیت المال میں کوئی شے نہ ہو تو پھر اس بات میں کوئی مضایقہ نہیں کہ بعض مسلمان بعض کو مالی امداد دیں کیونکہ تھوڑا سا مالی خسارہ برداشت کرنے سے بہت بڑے خسارے سے احتراز کیا جا سکتا ہے (یعنی دشمنوں کی تباہی و بربادی سے محفوظ رہا جا سکتا ہے) ۔ اور اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ جنگ حنین کے موقعہ پر نبی اکرم ﷺ نے صفوان سے کچھ زرہیں لی تھیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیوی والے مرد کی طرف سے بغیر بیوی والے شخص کو بھیجا کرتے تھے ، اور جو شخص جہاد کے قابل نہ ہوتا اس کا گھوڑا جہاد میں جانے والے کو دے دیتے ۔

بَابُ كَيْفِيَّةِ الْقِتَالِ

قتال کی کیفیت کے بیان میں

مسئلہ : مسلمان جب دارالحرب میں داخل ہو کر کسی شہر یا قلعے کا محاصرہ کر لیں تو سب سے پہلے انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دیں . جیسا کہ ابن عباسؓ نے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے کبھی کسی قوم سے جنگ نہیں کی جب تک کہ انہیں اسلام کی دعوت نہ دی ہو . اگر وہ دعوت اسلام کو قبول کرلیں تو ان سے جنگ نہ کی جائے . کیونکہ اصل مقصد حاصل ہو چکا ہے اور حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ لا اله الا الله کا اقرار کریں .

اگر وہ (خدانخواستہ) قبول اسلام سے انکار کریں تو پھر انہیں جزیہ ادا کرنے کو کہا جائے گا . نبی اکرم ﷺ امراء جیوش کو یہی حکم دیا کرتے تھے . دوسری بات یہ ہے کہ نص قرآنی کے مطابق جن امور سے قتال ختم ہوسکتا ہے ، جزیہ بھی من جملہ ان امور کے ایک امر ہے (نص قرآنی سے مراد یہ آیۃ ہے : قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ

دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ (التوبہ : ۲۹) : یعنی جنگ کرو اهل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روز آخر پر ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے ۔ (ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں ۔ یہ دعوت جزیہ ان لوگوں کے حق میں ہوگی جن سے جزیہ قبول ہوتا ہے ، اور جن سے جزیہ قبول نہیں کیا جاتا جیسے مرتدین اور عرب کے بت پرست تو انہیں قبول جزیہ کی دعوت دینے میں کوئی فائدہ نہیں ، کیونکہ ان سے سوائے اسلام کے کچھ قبول نہ کیا جائے گا ۔
اللہ تعالی کا ارشاد ہے : تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ (الفتح : ۱۶) : تم نے ان سے جنگ کرنی ہوگی یا وہ مطیع ہو جائیں گے اور اسلام قبول کر لیں گے ۔

اگر وہ جزیہ دینا قبول کرلیں تو ان کے لیے وہی حقوق ہیں جو مسلمانوں کے ہوتے ہیں اور ان کی وہی ذمہ داریاں ہوں گی جو مسلمانوں پر ہوتی ہیں ۔ حضرت علیؓ کا ارشاد ہے کہ انہوں نے جزیہ اس لیے دیا تا کہ ان کے خون ہمارے خونوں کی طرح ہو جائیں اور ان کے اموال ہمارے اموال کی طرح ہوں ۔ لفظ بذل سے مراد قبول ہے اور قرآن کریم میں اعطاء مذکور (حتی یُعْطُوْا) سے بھی یہی مراد ہے ۔

مسئلہ : اور ایسے کفار سے جنگ کرنا جائز نہیں جن کو دعوت اسلام ہی نہ پہنچی ہو ، تو پہلے انہیں اسلام کی طرف دعوت دی جائے گی . نبی اکرم ﷺ لشکر کے امراء کو یہی وصیت کرتے تھے کہ انہیں پہلے لا الہ الا اللہ کی شہادۃ کی طرف دعوت دیا کرو . کیونکہ دعوت دینے سے انہیں پتا چل جائے گا کہ ہماری اور ان کی جنگ دین کے لیے ہے ، ان کے مال چھیننے یا ان کے اهل و عیال کو قید کرنے کے لیے نہیں ہے . ممکن ہے وہ ہماری دعوت کا مثبت جواب دیں اور ہم جنگ و جدال کی مشقت برداشت کرنے سے بچ جائیں گے . اگر دعوت دیتے ہی مسلمان جنگ شروع کر دیں تو نہی کی بناء پر گناہگار ہوں گے ، لیکن ان کے خونوں کا تاوان مسلمانوں پر نہ ہوگا . کیونکہ کوئی چیز موجب تاوان نہیں ہے اور موجب تاوان سے مراد اسلام اور دارالاسلام کی حفاظت ہے تو یہ عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے کی طرح ہوگا . (یعنی حملہ کرنے کے دوران اگر کفار کی کچھ عورتیں اور بچے بھی مارے جائیں تو ان کے قتل کے سلسلے میں نہ تو قصاص ہوگا اور نہ دیۃ) .

مسئلہ : اور جن کفار کو دعوت اسلام پہنچ چکی ہو انہیں جنگ سے پہلے ایک بار پھر دعوت دینا مستحب ہوگا . تاکہ انجام سے ڈرانا مکمل ہو جائے مگر دوبارہ دعوت دینا واجب نہیں ہے . کیونکہ حضور ﷺ نے بنی مصطلق پر چھاپا مارا اور وہ غافل تھے اور حضرت اسامہؓ کو حکم دیا

تھا کہ وہ صبح کے وقت اُنہیں پر چھاپہ ماریں پھر اس گاؤں کو جلا دیں اور چھاپہ مارنا دعوت کے بعد نہیں ہوا کرتا ۔

مسئلہ : اگر محصورین جزیہ دینے سے منکر ہوں تو مسلمان اللہ تعالی سے مدد چاہتے ہوئے کفار پر ٹوٹ پڑیں ۔ سلیمان بن بریدہ کی حدیث میں مذکور ہے کہ اگر شہادة لا الہ الا اللہ سے انکار کریں ، تو انہیں قبول جزیہ کی دعوة دو .... فرمایا : اگر اس سے بھی انکار کریں تو ان کے خلاف اللہ تعالی سے مدد طلب کرو اور جنگ کرو ۔ کیونکہ اللہ تعالی ہی اپنے دوستوں کی مدد کرنے والا اور اپنے دشمنوں پر تباہی و بربادی مسلط کرنے والا ہے ۔ پس (دینی اور دنیوی) تمام امور میں اسی سے مدد طلب کی جائے (اس کے سوا اور کوئی استعانة کے قابل نہیں ہے ۔ ہم ہر روز کی نماز میں "ایاك نستعین" سے بھی یہی سبق حاصل کرتے ہیں ۔ ایک شاعر کا کہنا ہے :

نہیں طاقت سوا میرے کسی میں
کہ کام آئے تمہاری بے بسی میں

اور کفار کے خلاف منجنیق استعمال کی جائے ۔ (یہ پرانے زمانے کی توپ تھی جس میں بڑے بڑے پتھر ڈال کر قلعوں پر پھینکے جاتے تھے) جس طرح نبی اکرم ﷺ نے جنگ طائف میں استعمال فرمائی تھی ۔ اور ان کو جلا دیں کیونکہ حضور ﷺ نے بویرہ کو جلا دیا تھا ۔

امام قدوری ؒ نے فرمایا : اور ان پر پانی چھوڑ دیں، ان

کے درخت کاٹ دیں اور ان کی فصلیں تباہ کر دیں کیونکہ ان تمام باتوں کا مقصد کفار پر پریشانی طاری کرنا ، ذلت مسلط کرنا ، ان کی شوکت کو توڑنا اور ان کی جاعۃ کو منتشر کرنا ہے۔

اور ان پر پتھر برسانے میں کوئی مضایقہ نہیں ، خواہ ان کے پاس مسلمان قیدی یا مسلمان تاجر ہوں ۔ کیونکہ پتھروں سے مارنے کی صورت میں گروہ مسلمین سے ضرر عام کا ازالہ ہے اور مسلمان قیدی یا تاجر کا مر جانا ایک شخص کا نقصان ہے ۔ دوسری بات یہ ہے کہ شاذ و نادر ہی کوئی قلعہ مسلمانوں سے خالی ہوتا ہے ۔ پس اگر مسلمان کے لحاظ سے ایسا کرنا ممنوع ہو تو جہاد کا دروازہ بند ہو جائے گا ۔

اگر کفار مسلمانوں کے بچوں اور قیدیوں کو اپنے آگے ڈھال بنالیں تو پھر بھی پتھر مارنے سے نہ رکیں جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں اور مجاہدین پتھر یا تیر مارتے ہوئے کفار کی نیت کریں ، کیونکہ اگرچہ مسلمانوں اور کافروں کے درمیان بالفعل امتیاز کرنا ممکن نہیں ، لیکن نیت اور قصد سے تو یہ امتیاز کیا جا سکتا ہے ۔ اور اطاعت کا واجب ہونا وسعت کے مطابق ہوتا ہے اور اس سے جو نقصان مسلمان بچوں اور قیدیوں کو پہنچے گا اس سلسلے میں مجاہدین پر نہ کوئی دیۃ ہوگی اور نہ کفارہ ۔ کیونکہ جہاد فرض ہے اور فرائض کا تعلق تاوان سے نہیں ہوتا ۔ بخلاف حالت مخمصہ کے ، مخمصہ کی حالت میں تاوان کے خوف سے باز نہیں رہنا چاہیے کیونکہ

اس میں اپنی جان کو زندہ رکھنا مقصود ہوتا ہے۔ لیکن جہاد تو کافروں کی جان تلف کرنے پر مبنی ہے، تو مجاہد ضمان کے خوف سے قتل کرنے سے رک جائے گا۔ (حالت مخمصہ یہ ہے کہ انسان بھوک کی وجہ سے اس حالت تک پہنچ جائے کہ اگر کچھ کھانے کو نہ ملا تو جان جانے کا خطرہ ہے اور اس کے پاس سوائے غیر کے کھانے کے کچھ نہیں، تو وہ دوسرے کا کھانا کھا سکتا ہے جس سے اس کی جان بچ جائے اور اس کی قیمت کا ضامن ہوگا۔ باوجودیکہ اس نے جان بچانے کا فرض ادا کیا ہے پھر بھی اس پر تاوان لازم ہے۔ اسی طرح جہاد فرض ہے۔ کفار اگر مسلمانوں کو ڈھال بنا لیں اور مسلمان بھی مارے جائیں، اور مسلمانوں کے قتل کا تاوان اگر لازم کریں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مجاہدین جنگ کرنے ہی سے باز رہیں گے کہ کہیں کوئی مسلمان نہ مارا جائے اور تاوان نہ دینا پڑے تو اس طرح باب جہاد مسدود ہو جائے گا۔ مصنفؒ فرماتے ہیں کہ دونوں صورتوں میں فرق ہے بھوک کی حالت میں جان بچانا فرض ہوتا ہے اس لیے تاوان لازم ہوتا ہے۔ مگر جہاد میں کفار کا تلف کرنا مقصد ہوتا ہے، لہذا اس مقصد کے حصول کے لیے اگر چند مسلمانوں کی قربانی بھی دینا پڑے تو بھی تاوان لازم نہ ہوگا)۔

مسئلہ: امام قدوریؒ نے فرمایا کہ جب مسلمانوں کا لشکر بہت بڑا ہو جس کے بارے میں کوئی خدشہ نہ ہو تو عورتوں اور قرآن کریم کو ساتھ لے جانے میں کوئی مضایقہ

نہیں ۔ کیونکہ غالب حالت تو سلامتی ہے اور غالب کا حکم متحقق اور یقینی امر کی طرح ہوتا ہے ۔ لیکن ایک چھوٹے سے لشکر کی صورت میں جس کی سلامتی کا یقین نہیں عورتوں اور کتاب الہی کا ساتھ لے جانا ناپسندیدہ امر ہے ۔ کیونکہ ایسی صورت میں عورتوں کا ساتھ لے جانا ان کے ضائع کرنے کے مترادف ہے اور مصاحف کو لے جانے میں ان کی حقارت کا خوف ہے کیونکہ (خدانخواستہ مسلمانوں کی شکست کی صورۃ میں) وہ اپنا غصہ عورتوں اور مصاحف پر نکالیں گے اور حدیث میں حضور ﷺ کا جو ارشاد وارد ہے کہ قرآن کریم ساتھ لے کر دشمن کی سر زمین میں سفر نہ کیا کرو ۔ اس کی صحیح تأویل یہی ہے (کہ اگر کتاب اللہ کی هنك عظمة کا خوف ہو تو اِسے اپنے ساتھ لے کر نہ جایا کرو) ۔

اگر مسلمان امان لے کر کفار کی سر زمین میں جائے تو ساتھ قرآن کریم لے جانے میں کوئی حرج نہیں ، بشرطیکہ وہ کفار ایسے لوگ ہوں جو اپنے وعدوں کا ایفاء کرتے ہیں کیونکہ ظاہر یہی ہے کہ وہ تعرض نہیں کریں گے ۔

عمر رسیدہ عورتیں لشکر عظیم میں جا سکتی ہیں کیونکہ جو کام ان کے لائق ہیں انہیں وہ بطریق احسن سر انجام دے سکتی ہیں ۔ مثلاً کھانا پکانا ، پانی پلانا اور مریض اور زخمی مجاہدین کا علاج کرنا ۔ لیکن نوجوان عورتوں کا گھر پر قیام کرنا ہی کئی فتنوں کے ازالے کا سبب ہے اور میدان جنگ میں جانے والی عورتیں لڑائی میں حصہ نہ لیں ۔ کیونکہ

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان کمزور ہو چکے ہیں (جب ہی تو عورتوں کو بھی مقابلے میں لے آئے ہیں)، البتہ شدید ضرورت کے تحت اس کا جواز ہے اور مجاہدین اگر اپنی عورتوں کو بغرض جماع اور خدمت ساتھ لے جانا چاہیں تو یہ مناسب نہ ہوگا اور اگر چار و ناچار ساتھ لے جانا ہی ہے تو باندیوں کو لے کر جائیں آزاد عورتوں کو لے کر نہ جائیں۔

عورت اپنے شوہر کی اور غلام اپنے آقا کی اجازت کے بغیر جنگ میں شریک نہیں ہو سکتے، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ لیکن اگر دشمن کسی شہر پر اچانک حملہ کر دیں تو ضرورت کے تحت بلا اجازت شرکت کرنا بھی جائز ہے۔

مسئلہ: اور مسلمانوں پر لازم ہے کہ غدر نہ کریں۔ مال غنیمت سے چوری کر کے غلول یعنی خیانت نہ کریں اور نہ مُثلہ کریں۔ کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ نہ غلول کرو، نہ غدر کرو اور نہ مثلہ کرو۔ غلول کا مطلب ہے مال غنیمت سے چوری کرنا۔ غدر کا مطلب خیانۃ اور نقض عہد ہے۔ (مُثلہ: ناک کان کاٹ کر شکل بگاڑ دینے کو کہتے ہیں)۔ اور عُرینہ والوں کے بارے میں جو مُثلہ روایت کیا گیا ہے یہ مابعد کی نہی سے منسوخ ہے یہی منقول ہوا ہے۔

مسئلہ: عورتوں، بچوں، بوڑھوں، لنگڑوں اور اندھوں کو قتل کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ ہمیں ان کفار کے قتل کی اجازت ہے جو لڑنے کے قابل ہوں۔ مگر مذکورہ

لوگ جنگ کے قابل نہیں ہیں ۔ اسی بناء پر جس شخص کے جسم کا ایک پہلو خشک ہو چکا ہو یا جس کا دایاں ہاتھ کٹا ہوا ہو یا جس کے مخالف سمتوں کے ہاتھ اور پاؤں کٹے ہوئے ہوں ان کا قتل کرنا جائز نہیں ہے ۔

امام شافعیؒ شیخ فانی ، لنگڑے اور اندھے کے بارے میں ہم سے اختلاف کرتے ہیں ۔ کیونکہ ان کے نزدیک قتل کو مباح کرنے کا سبب کفر ہے ۔ مگر ہمارے دلائل ان کے خلاف حجة ہیں اور یہ روایت پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے بچوں اور عورتوں کے قتل سے منع فرمایا اور جب آپ نے ایک مقتولہ عورت کی لاش دیکھی تو فرمایا : افسوس کہ یہ تو لڑنے کے قابل نہیں تھی پھر اسے کیوں قتل کیا گیا ہے ؟

مسئلہ : امام قدوریؒ نے فرمایا کہ اگر ان مذکور افراد میں سے کوئی جنگی بصیرت رکھتا ہو یا عورت ملکہ ہو (تو ان کا قتل جائز ہوگا) کیونکہ ملکہ کا ضرر بندوں تک پہنچتا ہے ۔ اگر مذکور افراد سے کوئی شخص جنگ کرے تو اسے قتل کیا جائے گا تاکہ اس کی شرارت سے رہائی حاصل کی جا سکے ۔ دوسری بات یہ ہے کہ قتال دراصل اس کا قتل مباح کرتا ہے ۔

مسئلہ : مجنون کو قتل نہ کیا جائے کیونکہ وہ شریعة کا مخاطب ہی نہیں ۔ ہاں اگر وہ جنگ میں شریک ہو تو اس کے شر کو دور کرنے کے لیے اسے بھی قتل کر دیا جائے گا ۔

البتہ اتنی بات ہے کہ بچے اور مجنون کو اس وقت تک قتل کیا جا سکتا ہے جب تک کہ وہ لڑ رہے ہوں ، (اگر یہ قید ہو جائیں تو پھر ان کا قتل کرنا جائز نہ ہوگا) ۔ ان کے علاوہ دوسروں کو قید کرنے کے بعد قتل کیا جا سکتا ہے ۔ کیونکہ یہ لوگ اہل عقاب سے ہیں ۔ اسی بناء پر کہ یہ لوگ عقل و بلوغ کے لحاظ سے شرع کے مخاطب ہیں ۔ اگر اس پر کسی وقت جنون کا دورہ آتا ہو اور کسی وقت اسے افاقہ ہو جاتا ہو تو وہ افاقے کی حالت میں تندرست آدمی کی طرح ہوگا ۔

مسئلہ : اور مشرکین میں سے اپنے باپ پر پیش قدمی کرکے قتل کرنا مکروہ ہے کیونکہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے ۔ وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا (لقمان : ۱۵) : دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ ۔ نیز بیٹے پر واجب ہوتا ہے کہ وہ نفقہ دے کر باپ کو زندہ رکھے ، تو اس کو قتل کرنے کی مطلقاً اجازت ہونا اس کے منافی ہے ۔

اگر میدان جنگ میں باپ بیٹے کے مقابل آ جائے (تو اس پر خود وار نہ کرے بلکہ) اسے روک رکھے حتی کہ کوئی دوسرا شخص اسے قتل کر دے ۔ کیونکہ جب دوسرے سے مقصد حاصل ہو سکتا ہے تو اسے مقام گناہ میں قدم رکھنے کی کیا ضرورت ؟

اگر کافر باپ نے اسے قتل کرنا چاہا اور بیٹا اس کا حملہ نہیں روک سکتا سوائے اس کے کہ اسے جوابی حملہ کرکے قتل کر دے تو ان حالات میں قتل کر دینے میں کوئی حرج

نہیں کیونکہ اب اپنی ذات سے ضرر کا دور کرنا مقصد ہے ۔

کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اگر مسلمان باپ اپنے بیٹے پر تلوار سونت لے اور بیٹے کے لیے اس وار سے بچاؤ کی کوئی صورت نہ ہو سوائے اس کے کہ باپ کو قتل کر دے تو اسے قتل کر دے جیسا کہ ہم نے بیان کیا (کہ اپنی ذات سے ضرر کا دور کرنا ضروری ہوتا ہے) ۔ اور کافر باپ کی صورت میں دفع ضرر بدرجۂ اولی ہوگا یعنی اگر خدانخواستہ مسلمان باپ کفار کے ساتھ مقابلے میں آیا اور بیٹا مسلمانوں کے ساتھ ہے ، باپ نے بیٹے پر حملہ کر دیا تو اب اپنے بچاؤ کی خاطر بیٹا مسلمان باپ کو قتل کر سکتا ہے تو متن میں مذکور صورت میں تو بیٹے کو اپنی جان بچانے کے لیے کافر باپ کو قتل کرنا بدرجہ اولی روا ہوگا) ۔

بَابُ الْمُوَادَعَةِ وَمَنْ يَجُوْزُ آمَانَهُ

صلح اور جس کو امان دینا جائز ہے کے بیان میں

مسئلہ : جب امام مناسب سمجھے کہ اہل حرب سے یا ان میں سے ایک فریق کے ساتھ صلح کرے اور صلح کرنے میں مسلمانوں کی مصلحت کا پہلو نمایاں ہو تو صلح کر لینے میں کوئی مضایقہ نہیں ۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے : وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ (الانفال : ٦١) : اور اے نبی ! اگر دشمن صلح و سلامتی کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کے لیے جھک جاؤ اور اللہ تعالی پر بھروسا رکھو ۔ نیز نبی اکرم ﷺ نے حدیبیہ کے سال اہل مکہ سے صلح کی تھی کہ دس سال تک ہمارے اور ان کے درمیان جنگ موقوف رہے ۔ تیسری بات یہ ہے کہ جب صلح میں مسلمانوں کی بہتری ہو تو معنوی لحاظ سے صلح بھی جہاد ہی ہوگی ۔ کیونکہ اصل مقصد تو دفع شر ہے اور یہ مقصد صلح سے حاصل ہو جاتا ہے اور صلح کا حکم حدیث میں روایت کردہ مدت تک محدود نہ ہوگا ۔ کیونکہ جس سبب کی بناء پر صلح جائز ہے وہ مدت زیادہ بھی ہو سکتی ہے ۔

البتہ جب صلح کرنے میں مسلمانوں کی بہتری اور بھلائی نہ ہو (تو جائز نہ ہوگی) کیونکہ اس صورت میں صورۃً اور معنیً ترک جہاد لازم آتا ہے۔

مسئلہ : اگر امام کسی معین مدت کے لیے کفار سے صلح کرے پھر دیکھے کہ نقض صلح کی صورت زیادہ مفید اور مناسب ہے، تو صلح توڑنے کی اطلاع کفار کو دے دے اور ان سے جنگ کے لیے تیار ہو جائے، کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے پیش آمد حالات کے مد نظر وہ صلح ختم کر دی تھی جو ان کے اور اہل مکہ کے درمیان تھی۔ اس لیے کہ جب مصلحت ہی دوسرا رخ اختیار کرے تو صلح کا توڑنا ہی جہاد ہے اور صلح کو پورا کرنا صورۃً اور معنیً ترک جہاد شمار ہوگا۔ لہذا غدر سے بچنے کے لیے صلح کا توڑنا لازم ہوگا اور حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ وعدوں میں وفا ہے غدر نہیں۔ صلح اور جنگ کے درمیان اتنا عرصہ ضرور ہو جس میں تمام کفار کو نقض صلح کا علم ہو سکے۔ (اور حقیقۃً ہر فرد کا آگاہ ہونا ضروری نہیں بلکہ) اتنی مدت کافی ہے کہ جب کفار کے بادشاہ کو رد صلح کا علم ہو جائے تو وہ اطراف ملک کے باشندوں کو آگاہ کر سکے کیونکہ اس قدر مدت سے غدر کا الزام باقی نہیں رہتا۔

مسئلہ : امام قدوری ؒ نے فرمایا : اگر کفار خود خیانۃ سے کام لیں (یعنی بغیر اعلان کے صلح توڑ دیں) تو امام ان سے

جنگ کرے اور اب ان کی طرف نقض صلح کی خبر ارسال کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ، بشرطیکہ کفار نے متفقہ طور پر بد عہدی کی ہو ، کیونکہ اس صورت میں عہد کو توڑنے والے تو وہ خود ہیں تو اب ہماری طرف سے توڑنے کی ضرورت نہ رہی . بخلاف اس صورت کے کہ جب کفار کی ایک جماعة جسے قوۃ و شوکة حاصل نہیں ، ہمارے ملک میں آ کر رہزنی کرے تو قومی سطح پر یہ نقض عہد نہ ہوگا . لیکن اگر اس جماعة کو اپنے لوگوں کی حمایة و قوۃ حاصل ہو اور وہ علی الاعلان مسلمانوں سے جنگ کرنے لگیں تو ان کے حق میں نقض عہد ہوگا ، ان کے علاوہ دوسروں کے حق میں نہ ہوگا . کیونکہ یہ سب کچھ ان کے بادشاہ کی اجازۃ کے بغیر وقوع پذیر ہوا ہے . ان کے فعل کے دوسرے لوگ ملزم نہ ہوں گے . ہاں اگر یہ سب کچھ ان کے بادشاہ کے اشارے سے ہوا ہے تو یہ ان کی طرف سے نقض عہد ہوگا ، تو وہ عہد کو توڑنے والے ہوں گے کیونکہ معنوی طور پر یہ فعل ان سب کے اتفاق سے وقوع پذیر ہوا .

مسئلہ : اگر امام اہل حرب سے صلح کرنا مناسب سمجھے اور یہ کہ صلح کے بدلے میں ان سے مال لے تو کوئی حرج نہیں کیونکہ جب مال کے بغیر صلح کرنا جائز ہے ، تو مال کے بدلے میں بھی جائز ہوگی لیکن یہ صورة اس وقت مناسب ہے جب کہ مسلمانوں کو مال کی ضرورة ہو . لیکن جب مسلمانوں کو مال کی احتیاج ہی نہ ہو تو مال لینا جائز نہ ہوگا جیسا کہ

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں (کہ جہاد کا مقصد اعلاء کلمۃ اللہ ہے نہ کہ مال) ، اور ان سے لیا گیا مال انہیں مدات میں خرچ ہوگا جن میں جزیہ کی رقم خرچ کی جاتی ہے اور یہ حکم اس صورت میں ہے کہ جب مسلمانوں کا لشکر ان کے علاقے اور آبادی میں نہ ہو ، بلکہ انہوں نے قاصد بھیج کر صلح کی درخواست کی ہو ۔ کیونکہ یہ مال معنوی لحاظ سے جزیہ ہوگا ۔ لیکن اگر مسلمانوں کے لشکر نے انہیں محاصرے میں لے رکھا ہو اور مسلمان اس صورت میں مال لیں تو یہ مال غنیمت ہوگا اور اس کی تقسیم مال غنیمت کی طرح ہوگی ، یعنی ایک حصہ رکھ کر باقی چار حصے مجاہدین میں تقسیم کیے جائیں گے ۔ کیونکہ یہ مال معنوی طور پر انہیں مغلوب کرکے لیا گیا ہے ۔

مسئلہ:۔اگر مرتد لوگ امام کے سامنے صلح کی درخواست کریں تو امام غور و فکر کرکے صلح کر سکتا ہے ۔ کیونکہ ان کے دوبارہ ایمان لانے کی امید کی جا سکتی ہے ۔ ان کے اسلام لانے کی امید پر جنگ میں تأخیر کرنا جائز ہے ۔ لیکن اس صلح پر مال نہ لیا جائے گا کیونکہ ان سے جزیہ لینا جائز نہیں ۔ باب جزیہ میں اس کی تفصیل بیان کی جائے گی ۔ اگر مرتدین سے مال لے لیا تو واپس نہیں کیا جائے گا کیونکہ یہ مال محترم نہیں ہے ۔ اگر دشمن مسلمانوں کو محاصرے میں لے لیں اور اس شرط پر صلح کرنے کو تیار ہوں کہ مسلمان انہیں کچھ مال دیں ، تو امام اس

کی اجازۃ نہ دے کیونکہ ایسا کرنے میں دیة دینا مسلمانوں پر ذلت لانا ہوگا ۔ ہاں اگر محصورین کی ہلاکت کا خدشہ ہو (تو مال دینا جائز ہوگا) کیونکہ ہلاکت کا ازالہ جس طور بھی ممکن ہو واجب ہے ۔

مسئلہ : اہل حرب کے ہاں اسلحہ فروخت کرنا روا نہیں اور نہ ہی تاجر حضرات کے لیے جائز ہے کہ وہ اسلحہ بطور سامان تجارت لے جاکر فروخت کریں ۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے اہل حرب کے پاس ہتھیار فروخت کرنے اور ان کے پاس تجارت کی غرض سے لےجانے سے ممانعت فرمائی ہے ۔ دوسری بات یہ ہے کہ اسلحہ کی فروخت سے انہیں مسلمانوں کے خلاف جنگ میں تقویت حاصل ہوتی ہے ، لہذا ایسا کرنا ممنوع ہوگا اسی طرح ان کے ہاتھ گھوڑے فروخت کرنا بھی ممنوع ہے ، نیز لوہا بھی ، کیونکہ لوہا ہی تمام اسلحہ کی اصل ہے ۔ صلح کے بعد اسلحہ کی فروخت ممنوع ہوگی، ممکن ہے وہ اسلحہ فراہم ہونے کے بعد نقض عہد سے کام لیں ۔ یا صلح کی مدة ختم ہونے کے بعد وہی اسلحہ ہمارے خلاف استعمال کریں ۔ اشیاء خوردنی اور اشیاء پوشیدنی کے بارے میں بھی قیاس تو یہی تھا کہ ان کی فروخت بھی ممنوع ہو ، لیکن یہ فروخت نص سے ثابت ہے ، کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے ثمامہ کو حکم دیا تھا کہ اہل مکہ کو اناج بھیجے حالیکہ وہ آپ کے خلاف جنگ کرتے تھے ۔

فصل

امان دینے کے احکام کا بیان

مسئلہ : جب کسی آزاد مسلمان مرد یا آزاد مسلمان عورت نے کسی کافر یا کسی کافر جماعت یا اہل قلعہ یا اہل شہر کو امان دے دی تو یہ امان صحیح ہوگی اور مسلمانوں میں سے کسی کو بھی ان سے جنگ کرنا جائز نہ ہوگا . اس بارے میں حضور ﷺ کا ارشاد گرامی اصل کی حیثیت رکھتا ہے کہ مسلمانوں کے خون باہم برابر ہیں اور ان کی ذمہ داری کے لیے ان کا ادنی فرد بھی سعی کر سکتا ہے (یعنی مسلمانوں میں ادنی و اعلی سب کی ذمہ داریاں برابر ہیں ، سب کی دیت و قصاص برابر ہیں) . اور اگر ان کا ادنی یعنی ایک آدمی بھی پناہ دے دے تو لازم ہوگی . دوسری وجہ یہ ہے کہ ایک مسلمان بھی اہل قتال سے ہے اور کافر اس سے خوف کھائیں گے کیونکہ اسے اپنی پوری قوم کی حمایت حاصل ہے لہذا اس کی دی ہوئی امان اپنے محل میں واقع ہوئی ہے (یعنی جس سے خوف تھا اس نے امان دی ہے) اور یہ امان دوسرے مسلمانوں کی طرف سے بھی ہوگی کیونکہ اس کا سبب ایمان ہے اور وہ ٹکڑے نہیں ہوسکتا (بلکہ حقیقۃ واحدہ ہے) تو

امان کے بھی ٹکڑے نہ ہوں گے لہذا ایک مسلمان کی امان تمام مسلمانوں کی امان ہوگی جیسے کہ نکاح کرانے کی ولایت (یعنی اگر مساوی درجے کا کوئی ایک ولی نکاح کرا دے تو یہ سب اولیاء کی طرف سے نکاح ہوگا) . ہاں اگر ایک مسلمان کے پناہ دینے میں کوئی خرابی یا نقصان ہو تو امام اس عہد کے توڑنے کی اطلاع کفار کو دے دے جیسے کہ امام خود پناہ دے اور پھر اس امان کے توڑ دینے میں مصلحت دیکھے (تو توڑ سکتا ہے) . یہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں .

اگر امام نے ایک قلعے کا محاصرہ کیا اور لشکر میں سے کسی آدمی نے امان دے دی لیکن امان دینے کی صورت میں فتنہ و فساد کا احتمال ہے تو امام امان کو توڑ سکتا ہے جیسا کہ ہم سابقاً بیان کر چکے اور اس لشکری کو سزا دی جائے گی کیونکہ اس نے اپنی رائے پر سبقت کی . لیکن اگر اس کے امان دینے میں کوئی مصلحت دیکھے (تو لشکری کو سزا نہ دے) کیونکہ بعض اوقات تأخیر کرنے سے مصلحت ہاتھ سے جاتی رہتی ہے ، لہذا اسے معذور تصور کیا جائے گا .

ذمی کا امان دینا جائز نہیں کیونکہ کافروں کو امان دینے میں اس پر اتہام آ سکتا ہے نیز اسے مسلمانوں پر حق ولایت بھی حاصل نہیں .

مسئلہ : وہ لوگ جو دشمن کے ہاتھ میں قید ہیں یا

مسلمان تاجر جو ان کے ہاں گئے ہوئے ہیں وہ انہیں امان نہیں دے سکتے کیونکہ یہ تو کفار کے ہاتھوں میں مجبور و مقہور ہیں اور ان سے کفار کو کوئی خوف نہیں ہوتا اور امان محل خوف کے ساتھ مخصوص ہے (یعنی امان وہ دے سکتا ہے جس سے کفار کو کوئی خوف ہو) . دوسری بات یہ ہے کہ کفار اسیر اور تاجر کو امان دینے پر مجبور بھی کر سکتے ہیں . (لہذا یہ امان قابل اعتبار نہیں ہوتی) اور ایسی امان مصلحت سے عاری ہوتی ہے . تیسری بات یہ ہے کہ جب بھی ان پر مشکل آ پڑے گی تو اسیروں اور تاجروں سے امان لے کر اپنے آپ کو بچا سکتے ہیں . اس طرح تو مسلمانوں کے لیے فتوحات کے دروازے ہی بند ہو جائیں گے اور جو شخص دارالحرب میں اسلام قبول کر لے لیکن ھجرت کرکے دارالاسلام میں نہ آ جائے تو اس کا امان دینا درست نہ ہوگا جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں .

مسئلہ : امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک محجور غلام کا امان دینا صحیح نہیں ، ہاں اگر آقا اسے جنگ میں اجازت دے (تو دے سکتا ہے) .

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ اس کا امان دینا درست ہے اور امام شافعیؒ کی رائے بھی یہی ہے . امام ابو یوسفؒ ایک روایت کے مطابق امام محمدؒ کے ساتھ ہیں اور ایک روایت کے مطابق امام ابو حنیفہؒ سے اتفاق رکھتے ہیں .

امام محمدؒ کی دلیل یہ حدیث ہے . حضور ﷺ نے فرمایا

کہ غلام کی امان بھی امان ہوتی ہے ۔ اس کو حضرت ابو موسی اشعری رض نے روایت کیا ہے کیونکہ غلام بھی مؤمن ہے اور صاحب قوت بھی ہے ۔ اور اس غلام پر جس کو لڑنے کی اجازت ہے قیاس کرتے ہوئے اس کا امان دینا بھی صحیح ہوگا ۔ اور جیسے غلام ایک حربی کو ذمی بننے کا تحریری عہد نامہ لکھ دے تو حربی ذمی بن جاتا ہے اور غلام کے بارے میں ہم نے ایمان کی شرط اس بناء پر لگائی کیونکہ ایمان عبادت کے لیے شرط کی حیثیت رکھتا ہے ۔ اور جہاد بھی عبادت ہے ۔ اور صاحب قوت ہونے کی شرط اس لیے عاید کی تاکہ اس سے خوف کا ازالہ متحقق ہو سکے ۔ اور محجور کو ماذون غلام پر اس لیے قیاس کیا کہ دونوں کے امان دینے میں دین کے اعزاز اور مسلمانوں کے حق میں مصلحت اور بہتری کا پہلو نمایاں ہے کیونکہ یہ مسئلہ اسی صورت میں ہے کہ جب مصلحت نمایاں ہو ۔ رہی یہ بات کہ محجور کو لڑنے کی قدرت نہیں تو یہ ممانعت اس بات کے مد نظر ہے کہ آقا کی منفعة میں تعطل لازم آتا ہے اور امان دینا تو ایک قول ہے اور صرف قول سے آقا کے منافع میں تعطل نہیں آتا ۔

امام ابو حنیفہ رح اس کے جواب میں فرماتے ہیں ۔ کہ غلام کے لیے قتال ممنوع ہے تو اس کی امان درست نہ ہوگی، کیونکہ کفار کو اس سے کوئی خوف نہیں تو امان اپنے محل ومقام میں واقع نہ ہوگی بخلاف اس غلام کے جس کو قتال

کی اجازت ہو کیونکہ اس سے خوف متحقق ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ محجور غلام کو قتال کی قدرت نہیں کیونکہ اس سے آقا کے حق میں اس طور پر تصرف ہوتا ہے جو احتمال ضرر سے خالی نہیں۔ اور امان دینا بھی ایک لحاظ سے قتال ہے اور قتال میں آقا کے حق میں ضرر ہے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ تیسری بات یہ ہے: ممکن ہے کہ غلام امان دینے میں غلطی کرے بلکہ اس کا غلطی کرنا ظاہر ہے (کیونکہ غلام ہمہ وقت آقا کی خدمت میں مصروف رہتا ہے وہ جنگی امور اور سیاست میں بصیرت کہاں سے حاصل کرے گا)۔ نیز اس سے غنیمت حاصل کرنے کا دروازہ بند ہو جائے گا بخلاف ماذون غلام کے، کیونکہ آقا اسے اجازت دے کر گویا اس کے فعل پر راضی ہے۔ اور چونکہ ماذون جنگ لڑنے کی بناء پر حربی آداب و قواعد سے آگاہ ہوتا ہے لہذا اس سے غلطی کا امکان شاذ و نادر ہی ہوگا۔ اور بخلاف عہد ذمہ کے (یعنی محجور جب کسی حربی کو تحریر لکھ دے تو ذمی بن جاتا ہے کیونکہ ذمی ہوجانا اس کافر کے مسلمان ہونے کے قائم مقام ہوگا اور یہ عہد نامہ بمنزلہ دعوۃ الی الاسلام کے ہوگا۔ نیز اس صورت میں جزیہ کے منافع بھی ہیں۔ نیز کفار جب ذمی ہونے کی درخواست کریں تو اس کا قبول کرنا ضروری ہوتا ہے اور فرض کی ادائیگی بھی ایک قسم کا نفع ہے۔ تو دونوں صورتوں میں فرق بالکل واضح ہو گیا (یعنی عہد ذمہ کی تحریر میں اور

امان دینے میں) ۔

اگر ایسا بچہ امان دے جو عقل نہیں رکھتا تو اس کی امان مجنوں کے امان دینے کی طرح صحیح نہ ہوگی لیکن اگر بچہ نفع و نقصان سمجھتا ہو اور دین سے آگاہی رکھتا ہو لیکن اسے لڑنے کی اجازت نہ ہو تو اس صورت میں مذکورہ اختلاف ہوگا ۔ اگر اسے جنگ میں لڑنے کی اجازت ہو تو صحیح قول کے مطابق بالاتفاق اس کا امان دینا صحیح ہوگا ۔

بَابُ الغَنَائِمِ وَ قِسْمَتِهَا

مال غنیمت اور اس کی تقسیم کا بیان

مسئلہ : اگر امام کسی شہر کو بزور شمشیر فتح کر لے تو اسے مسلمانوں کے درمیان تقسیم کر دے جس طرح رسول اللہ ﷺ نے خیبر میں کیا تھا ۔ اور اگر چاہے تو وہاں کے لوگوں کو اس پر برقرار رکھے اور ان پر جزیہ عاید کر دے اور ان کی زمین پر خراج مقرر کر دے ۔ حضرت عمر رض نے صحابہ رض کے اتفاق کے بعد سواد عراق میں ایسے ہی کیا تھا اور جن صحابہ رض نے موافقت نہ کی ان کی بات کو سراہا نہیں گیا تھا ۔ اور دونوں صورتوں میں نمونہ موجود ہے (یعنی تقسیم کرنے میں نبی اکرم ﷺ کا نمونہ اور باقی رکھنے میں حضرت عمر رض اور صحابہ کرام رض کی مثال) ۔ پس امام کو اختیار حاصل ہوگا ۔

بعض حضرات نے کہا کہ اگر مجاہدین کو ضرورت ہو تو پہلی صورت (یعنی تقسیم کرنا) اولی ہوگی ، اور اگر مجاہدین کو حاجت نہ ہو تو دوسری صورت مناسب ہوگی کہ آئندہ انہیں جب ضرورت ہو تو تقسیم کر لیں (کہ

ان کے واسطے یہ سامان تو تیار ہی ہوگا) . یہ مسئلہ غیر منقولہ جائداد کی صورت میں ہے، لیکن منقولہ مال کی صورت میں ان پر احسان کرتے ہوئے واپس دینا جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ شریعة میں اس قسم کی اجازت وارد نہیں ہے .

غیر منقولہ اراضی میں امام شافعیؒ کا اختلاف ہے، کہ بطور احسان اراضی کے برقرار رکھنے میں مجاہدین کی حق تلفی ہے اور ان کی ملکیة کا ابطال لازم آتا ہے اور کسی مساوی بدلے کے بغیر احسان کرنا جائز نہیں اور خراج اس کا مساوی بدلہ نہیں ہے کیونکہ اس کی مقدار بہت کم ہوتی ہے . بخلاف رقاب کے (یعنی جب کفار پر غلبہ حاصل کرلیا جائے تو ان کو غلام بنایا جا سکتا ہے تو اس بارے میں امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ ان کو غلام بنا کر تقسیم کرنا ضروری نہیں) کیونکہ امام کو اختیار ہے کہ ان کو قتل کر دے تو مجاہدین کا ان کی گردنوں میں حق ثابت نہیں ہوتا (کہ انہیں ضرور ہی غلام بنائیں) .

ہماری پیش کردہ روایت یعنی حضرت عمرؓ کا فعل امام شافعیؒ پر حجة ہے . دوسری بات یہ ہے کہ مشرکین کو اراضی پر برقرار رکھنے میں یہ مصلحت ہے کہ وہ مسلمانوں کے لیے بطور کاشتکار کام کریں گے، اور فن زراعت سے واقف بھی ہیں اور زراعت کے اخراجات کا بوجھ بھی ان پر ہوگا . باین همہ یہ اراضی وغیرہ بعد میں آنے والے لوگوں کے لیے تیار سامان کی صورت میں مہیا ہوگی اور

خراج اگرچہ فی الحال کم نظر آتا ہے مگر چونکہ اس کی وصولی ہمیشہ ہوتی رہے گی اس لیے وہ مال کثیر ہی مقصور ہوگا۔ اگر امام نے احسان کر کے ان کی گردنیں آزاد کر دیں اور اراضی پر ان کو برقرار رکھا تو مال منقولہ سے انہیں اس قدر واپس دے دے جس سے وہ کاشتکاری وغیرہ کا کام چلا سکیں ، اور یہ معاملہ حد کراہت سے نکل جائے (کیونکہ ان کا تمام مال لے لیا جائے تو ان کے سارے کام کاج ہی معطل ہو کر رہ جائیں گے اور یہ کوئی اچھا فعل نہیں ہے) ۔

مسئلہ : امام قدوریؒ نے فرمایا کہ امام کو قیدیوں کے بارے میں اختیار ہے اگر چاہے تو انہیں قتل کر دے کیونکہ حضور ﷺ نے قتل کیا تھا ۔ نیز قتل کر دینے سے مادۂ فساد ختم ہو جائے گا (اور کفار کی افرادی قوت ٹوٹ جائے گی) ۔ اور اگر چاہے تو انہیں غلام بنا لے کیونکہ اس سے ایک تو ان کا فتنہ و فساد مٹ جائے گا اور دوسرے مسلمانوں کے لیے منافع کی کثرت ہوگی ۔ اور اگر چاہے تو انہیں آزاد کر کے مسلمانوں کا ذمی بنا دے جیسا کہ ہم حضرت عمرؓ کا قصہ بیان کر چکے ہیں ، لیکن عرب کے مشرکین اور مرتدین کے لیے یہ حکم نہ ہوگا ۔ اس کی تفصیل إن شاء اللہ آئندہ اوراق میں بیان کی جائے گی ۔

قیدیوں کو دار الحرب میں لوٹانا جائز نہیں کیونکہ اس میں کفار کو مسلمانوں کے خلاف تقویت حاصل ہوگی ۔ اگر قیدی اسلام لے آئیں تو ان کا قتل جائز نہ ہوگا کیونکہ

قتل کے بغیر بھی ان کے شر کا ازالہ ہو گیا ہے ، البتہ ان قیدیوں کو (جو مشرف بہ اسلام ہوگئے ہیں) غلام بنایا جا سکتا ہے کیونکہ ملکیة کا سبب پیدا ہونے کے بعد ان سے زیادہ منافع حاصل کیے جاسکتے ہیں . بخلاف اس صورت کے کہ جب وہ گرفتار ہونے سے پہلے مشرف باسلام ہو جائیں (تو انہیں غلام بنانا جائز نہ ہوگا) کیونکہ ابھی تک ان کے غلام بنانے کا سبب پیدا نہیں ہوا .

مسئلہ : امام ابو حنیفہؒ کی رائے میں کافر قیدیوں کا فدیہ نہیں لیا جائے گا . صاحبینؒ کا کہنا ہے کہ مسلمان قیدیوں کے بدلے ان کو چھوڑ دینا جائز ہے . امام شافعیؒ کا بھی یہی قول ہے کیونکہ ایسا کرنے میں مسلمانوں کی رہائی ہے اور مسلمان کی رہائی کافر کے قتل یا اس کے غلام بنا کر نفع حاصل کرنے سے اولی ہے .

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ ایسا کرنے میں کافروں کی معاونت اور ان کی تقویت لازم آتی ہے کیونکہ وہ واپس جا کر پھر ہمارے خلاف لڑنے کو تیار ہوں گے ، اور اس کی جنگی برائی کو دور کرنا مسلمان قیدی کے چھڑانے سے بہتر ہے ، کیونکہ اگر وہ ان کے ہاتھوں میں گرفتار رہا تو یہ اس کے حق میں ابتلاء ہوگا تمام مسلمانوں پر نہ ہوگا ، اور کافروں کو ان کا قیدی دے کر تقویت دینا سب مسلمانوں کے لیے باعث ضرر ہے . رہا کافر قیدیوں کو مال کے بدلے چھوڑنا ہمارے مشہور مذہب کے مطابق جائز نہیں جیسا کہ

ہم بیان کر چکے ہیں (کہ اس سے کفار کو تقویۃ حاصل ہوگی) .

سیر کبیر میں مذکور ہے کہ جب مسلمانوں کو مال کی شدید احتیاج ہو تو کافر قیدیوں کو مال کے بدلے چھوڑنے میں کوئی مضایقہ نہیں . اور بدر کے قیدیوں کے سلسلے میں اس کی نظیر موجود ہے (ان کا فدیہ چار ہزار کے قریب تھا) . اگر قیدی ہمارے ہاں اسلام قبول کرچکا ہو تو اسے اس مسلمان قیدی کے بدلے میں نہ دیا جائے گا جو ان کے ہاتھوں میں قید ہے کیونکہ اس کا کوئی خاص فائدہ نہیں (کہ ایک مسلمان کو کفار کے ہاتھ میں دے کر دوسرے کو چھڑایا جائے) . ہاں اگر وہ اپنی خوشی سے بدلے میں جانا چاہے اور اس کے بارے میں اسلام سے برگشتہ ہو جانے کا خدشہ نہ ہو (تو ایسا تبادلہ کیا جا سکتا ہے) .

مسئلہ : امام قدوریؒ نے فرمایا کہ کافر قیدیوں پر احسان کرکے چھوڑنا جائز نہیں . امام شافعیؒ کو اس سے اختلاف ہے ، وہ فرماتے ہیں کہ جنگ بدر کے بعض اسیروں کو آپ نے از راہ احسان رہا کر دیا تھا . ہماری دلیل اللہ تعالی کا یہ ارشاد ہے : **فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ** (التوبۃ : ۵) یعنی جہاں کہیں بھی تم مشرکین کو پاؤ انہیں قتل کرو .

دوسری بات یہ ہے کہ اسے قید کرنے اور مغلوب کر لینے سے اسے غلام بنانے کا حق حاصل ہوگیا ہے تو اس

حق کا بغیر کسی منفعة اور بدلے کے ساقط کرنا جائز نہ ہوگا ۔ اور امام شافعیؒ کی روایت کردہ حدیث ہماری ذکر کردہ آیة سے منسوخ ہوگی ۔

مسئلہ : جب امام دارالاسلام کی طرف واپسی کا ارادہ کرے اور اس کے ساتھ کچھ مویشی بھی ہوں جن کا دارالاسلام میں لانا ممکن نہیں ہے ، تو انہیں ذبح کرکے جلا دے ، ان کو مار کر نہ پھینک دے اور نہ ہی زندہ چھوڑے ۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ انہیں چھوڑ دے کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے بکری کے ذبح کرنے سے منع فرمایا جب تک کہ اس کا کھانا مقصود نہ ہو ۔ ہم کہتے ہیں کہ کسی صحیح غرض کے لیے حیوان کا ذبح کرنا جائز ہے ۔ اور دشمن کی کی قوة کو کمزور کرنے سے بڑھ کر اور کیا غرض صحیح ہو سکتی ہے ۔ آگ سے جلانے کا حکم اس لیے ہے تاکہ کفار اس سے نفع حاصل نہ کر سکیں تو یہ ان کے گھروں کو گرانے کی طرح ہوگا ۔ البتہ ذبح کرنے سے پہلے جلانا جائز نہیں کیونکہ زندہ چیز کو جلانے کی شرع میں ممانعت ہے ۔ اور اسی طرح جانور کے پاؤں کاٹنا بھی جائز نہیں ، کیونکہ اس سے مثلہ لازم آتا ہے اور ان کے ہتھیار بھی جلا دیے جائیں ، اور جو ہتھیار نہ جلائے جا سکتے ہوں انہیں ایسی جگہ زمین میں دبا دیا جائے جس کا کفار کو علم نہ ہو تاکہ ان کی منفعت جاتی رہے ۔

مسئلہ : غنیمت کو دارالحرب میں تقسیم نہ کیا جائے

بلکہ وہاں سے نکال کر دارالاسلام میں لایا جائے. امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ دار الحرب میں تقسیم کیا جا سکتا ہے . ہمارے نزدیک اس کا اصل یہ ہے کہ مال غنیمت کو جب تک دارالاسلام میں لاکر محفوظ نہ کر لیا جائے اس وقت اس میں مجاہدین کی ملکیۃ ثابت نہیں ہوتی ، اور امام شافعیؒ کے نزدیک ہوجاتی ہے . اور اسی اصل کی بناء پر بہت سے مسائل متفرع ہوتے ہیں جو ہم نے کفایة المنتہی میں ذکر کیے ہیں .

امام شافعیؒ کی دلیل یہ ہے کہ جب کسی مباح مال پر استیلاء حاصل ہو جاتا ہے تو ملکیۃ کا سبب پیدا ہو جاتا ہے ، جیسا کہ شکاری جانوروں میں ہوتا ہے (کہ جو شخص اسے شکار کرلے اسی کی ملکیۃ ہوگا) . اور استیلاء نام ہے اس چیز پر قبضہ کرنے کا. اور دارالحرب میں اس قبضے کا تحقق ہو چکا ہے .

ہماری دلیل یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے دارالحرب میں غنیمت کے فروخت کرنے سے منع فرمایا . اور دارالحرب میں مال غنیمت کے فروخت کرنے میں اختلاف بھی ہے . اور غنیمت کا تقسیم کرنا معنوی لحاظ سے فروخت ہے تو یہ بھی ممانعت کے تحت داخل ہوگی. اور استیلاء کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو حفاظت کرنے اور منتقل کرنے کا قبضہ حاصل ہو جائے. مگر منتقل کرنے کا قبضہ ابھی معدوم ہے کیونکہ ابھی ان کو یہ قدرت ہے کہ وہ اپنے اموال مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھڑا لیں اور اس کا امکان ظاہر ہے (کیونکہ ابھی تک

مسلمان ان کے علاقے میں ہیں) ۔

پھر کہا گیا مقام اختلاف یہ ہے کہ جب امام نے اجتہاد کے بغیر مال تقسیم کر دیا تو کیا تقسیم کے احکام مترتب ہوں گے یا نہیں ، کیونکہ ملکیۃ کا حکم ملکیۃ کے بغیر ثابت نہیں ہوتا ۔

بعض حضرات نے کہا کہ اختلاف کراہت میں ہے اور امام محمدؒ کے نزدیک یہ کراہت تنزیہی ہے ، کیونکہ امام محمدؒ نے سیر کبیر میں ذکر کیا ہے ۔ کہ امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق دارالحرب میں تقسیم جائز نہیں ہوتی ۔ اور امام محمدؒ کے نزدیک افضل یہ ہے کہ غنیمت کو دارالاسلام میں تقسیم کیا جائے ۔

اور کراہت کی وجہ یہ ہے کہ تقسیم کے باطل ہونے کی جانب کو ترجیح ہے ۔ البتہ اس دلیل میں یہ قوۃ نہیں کہ عدم جواز میں مؤثر ہو ۔ تو کم از کم اس سے کراہت کا ثبوت ضروری ہوگا ۔

مسئلہ : امام قدوریؒ نے فرمایا : لشکر میں مدد کرنے والے اور لڑنے والے برابر ہیں کیونکہ سبب میں دونوں یکساں ہیں ۔ ہمارے نزدیک سبب یہ ہے کہ انسان جنگ کی نیت سے اپنی سرحدوں سے آگے بڑھ جائے اور امام شافعیؒ کے نزدیک معرکۂ جنگ میں حاضر ہونا سبب ہے ، جیسا کہ اپنے مقام میں مذکور ہے ۔ اسی طرح اگر مرض یا کسی اور وجہ سے جنگ میں نہ لڑ سکے (تو بھی برابر کا حصہ ملے گا) کیونکہ

سبب میں دونوں مساوی ہیں ۔

مسئلہ: اگر غنیمت کو ابھی تک دارالحرب سے دارالاسلام میں منتقل نہیں کیا تھا کہ مسلمانوں کا ایک اور لشکر دارالحرب میں مدد کو آ پہنچا تو وہ بھی مال غنیمت میں شریک ہوں گے ۔ لڑائی کے ختم ہو جانے کے بعد آنے کی صورۃ میں امام شافعیؒ کا اختلاف ہے ۔ اس اختلاف کی وجہ وہی اصل ہے جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں (ان کے نزدیک ملکیۃ قبضہ سے ثابت ہو جاتی ہے اور ہمارے نزدیک ملکیۃ کا سبب طاقت اور قہر سے حاصل کرنا ہے) ۔

ہمارے نزدیک شرکۃ کا حق اسی وقت منقطع ہوگا جب کہ مال غنیمت نکال کر دارالاسلام میں محفوظ کر لیا گیا ہو ، یا امام دارالحرب ہی میں تقسیم کر چکا ہو ، یا مال غنیمت کو فروخت کیا جا چکا ہو ۔ کیونکہ ان مذکورہ تینوں صورتوں میں ملکیۃ مکمل ہو چکی ہوتی ہے ۔ لہذا مدد کے لیے آنے والے گروہ کا حق منقطع ہو جائے گا ۔

مسئلہ: امام قدوریؒ نے فرمایا : اور لشکر کے بازار کے لوگوں کے لیے غنیمت میں کوئی حق نہ ہوگا (یعنی لشکر کے ساتھ بعض لوگ سودا سلف لے کر چلے جاتے ہیں کہ مجاہدین کو اشیاء ضروریہ فراہم کریں گے) ۔ ہاں اگر وہ بھی جنگ میں شریک ہوں (تو انہیں حصہ ملے گا) ۔ امام شافعیؒ کا ایک قول یہ ہے کہ مال غنیمت میں ان کا حصہ بھی ہوگا ۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو بھی جنگ میں حاضر ہو اسے

حصہ ملے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس نے اپنی شمولیت سے لشکر اسلام میں اضافہ کیا ہے لہذا معنوی طور پر بھی وہ جہاد میں شامل ہوگا۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ اس نے نیت قتال سے دارالاسلام کی حدود کو پار نہیں کیا تو ظاہری سبب اس کے حق میں مؤید نہ ہوگا۔ تو پھر سبب حقیقی یعنی قتال کا اعتبار کیا جائے گا اور اس کی حالة کے مطابق استحقاق ثابت ہوگا۔ اگر اس نے سوار ہو کر جنگ کی تو سوار کا حصہ ملے گا۔ اور اگر پیادہ پا جنگ کی تو اسی کے مطابق حصہ ملے گا۔ اور امام شافعیؒ نے جو حدیث اپنی تائید میں پیش کی ہے وہ حضرت عمرؓ پر موقوف ہے۔ یا اس کی تأویل یہ ہے کہ قتال کا قصد کرتے ہوئے میدان جنگ میں حاضر ہوا ہو۔

مسئلہ: اگر امام کے پاس اس قدر بار برداری کے جانور نہ ہوں کہ جن پر مال غنیمت لادا جا سکے تو اسے وہیں مجاہدین میں تقسیم کر دے۔ یہ تقسیم امانة و ودیعة کے طور پر ہوگی تاکہ وہ اپنی نگرانی میں دارالاسلام تک لے چلیں؛ دارالاسلام میں پہنچ کر ان سے واپس لے لے اور باقاعدہ تقسیم کرے۔ مصنفؒ فرماتے ہیں کہ مختصر القدوری میں اسی طرح مذکور ہے اور اس میں مجاہدین کی رضا مندی کی شرط نہیں ہے اور ''السیر الکبیر'' کی روایة بھی ایسے ہی ہے۔
حاصل کلام یہ ہے کہ اگر مال غنیمت میں بار برداری کے جانور بھی ہاتھ آ جائیں تو مال غنیمت ان پر لادا جائے

کیونکہ مال اور وہ جانور جن پر مال لادا جاتا ہے دونوں ان کے مال ہیں۔ اسی طرح اگر بیت المال کے بار برداری کے جانور ہوں (تو ان پر بھی مال غنیمت لادا جا سکتا ہے، کیونکہ بیت المال بھی مسلمانوں ہی کا ہوتا ہے۔ اگر باربرداری کے جانور مجاہدین کی یا ان میں سے بعض کی ملکیۃ ہوں تو ''السیر الصغیر'' کی روایۃ کے مطابق امام انھیں مجبور نہیں کرسکتا، کیونکہ یہ ابتدائی اجارہ ہے۔ اور اس کی صورۃ ایسی ہوگی جیسے جنگل میں کسی کا جانور مر جائے اور اس کے رفیق سفر کے پاس اس کی ضرورۃ سے زائد ایک جانور ہو (تو اس پر کرائے کے لیے جبر نہیں کر سکتا)۔ لیکن ''السیر الکبیر'' کی روایۃ کے مطابق انھیں مجبور کر سکتا ہے کیونکہ خاص ضرر میں ضرر عام کا ازالہ ہے۔

مسئلہ: دارالحرب میں تقسیم سے پہلے مال غنیمت کا فروخت کرنا جائز نہیں، کیونکہ تقسیم سے پہلے ملکیۃ ثابت نہیں ہوتی۔ اس میں امام شافعیؒ کا اختلاف ہے۔ اختلاف کی بنیاد ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔

مسئلہ: اور مجاہدین میں سے جو شخص دارالحرب میں وفات پا جائے اس کا غنیمت میں کوئی حق نہ ہوگا اور جو شخص مال غنیمت کے دارالاسلام میں لانے کے بعد فوت ہو اس کا حصہ اس کے ورثاء کو ملے گا۔ کیونکہ ملک میں وراثۃ کا اجراء ہوتا ہے لیکن مال غنیمت کے دارالاسلام میں لا کر محفوظ ہونے سے پہلے ملکیۃ نہیں ہوتی بلکہ اس کے بعد ثابت

ہوتی ہے۔ امام شافعیؒ نے فرمایا کہ جو شخص کفار کے شکست کھانے کے بعد فوت ہو اس کا حصہ ورثاء کو ملے گا۔ کیونکہ امام شافعیؒ کے نزدیک دارالحرب ہی میں ملک ثابت ہوتی ہے۔ اس کی تفصیل ہم سابقہ اوراق میں بیان کرچکے ہیں۔

مسئلہ : امام قدوریؒ نے فرمایا : دارالحرب میں لشکر کے جانوروں کو چارا مہیا کرنے میں کوئی حرج نہیں اور مجاہدین کو جو کچھ کھانے کے لیے میسر آئے کھائیں۔ مصنفؒ فرماتے ہیں کہ امام قدوریؒ نے مطلقاً ذکر کیا ہے ساتھ ضرورت کی شرط نہیں لگائی۔ لیکن امام محمدؒ نے "السیر الصغیر" میں ضرورت کی شرط لگائی ہے۔ البتہ "السیر الکبیر" میں بھی شرط کا ذکر نہیں۔ پہلی روایۃ کی وجہ یہ ہے کہ یہ مال تمام غازیوں میں مشترک ہے تو ضرورت کے بغیر اس سے انتفاع جائز نہ ہوگا، جیسا کہ کپڑوں اور چوپایوں کی صورۃ میں ہے (کہ بغیر ضرورت کے ان سے انتفاع مباح نہ ہوگا)۔

دوسری روایۃ کی وجہ یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے طعام خیبر کے بارے میں فرمایا : تم بھی کھاؤ اور جانوروں کو بھی کھلاؤ لیکن لاد کر نہ لے جاؤ۔ دوسری بات یہ ہے کہ حکم کا مدار دلیل حاجۃ پر ہوتا ہے اور وہ دارالحرب میں ہوتا ہے۔ کیونکہ اپنے کھانے کا سامان اور جانور کا کا چارا دارالحرب میں قیام کی مدت کے لیے نہیں لے جا سکتا اور پیچھے سے رسد کا پہنچنا منقطع ہو جاتا ہے۔ تو ضرورۃ

کے مد نظر وہاں سے کھانا پینا اپنے اصل کے لحاظ سے مباح ہوگا، بخلاف ہتھیار کے کیونکہ غازی ہتھیار تو ساتھ لے کر چلتا ہے، اس لیے دلیل حاجۃ موجود نہ ہوگی۔ اور گاہے گاہے اسلحہ کی ضرورۃ بھی در پیش آ جاتی ہے تو حاجۃ کی حقیقت کا اعتبار ہوگا۔ پس ضرورۃ کے مطابق استعمال کرے اور جب ضرورت رفع ہو جائے تو مال غنیمت میں واپس کر دے۔ اور جانور کی حیثیۃ بھی ہتھیار جیسی ہے (یعنی ضرورۃ کے مدنظر استعمال کیا جا سکتا ہے)۔ اور طعام سے مراد روٹی، گوشت، گھی اور تیل وغیرہ کی مانند ہے۔

مسئلہ: امام قدوریؒ نے فرمایا: جلانے کی لکڑی بھی استعمال کی جا سکتی ہے اور بعض نسخوں میں حطب کی بجائے طیب کا لفظ ہے۔ طیب بمعنی خوشبو جیسے عطر وغیرہ اور بالوں کو تیل بھی لگایا جا سکتا ہے اور جانوروں کے پاؤں کو بھی لگایا جا سکتا ہے، کیونکہ ان تمام امور کی ضرورۃ درپیش آتی رہتی ہے۔ اور جو ہتھیار بھی میسر ہوں انھیں لے کر لڑیں۔ اور سب کچھ تقسیم کے بغیر بھی مباح ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ایسے ضرورۃ در پیش ہو مثلاً اس کا اپنا ہتھیار نہ رہے (ٹوٹ جائے یا گم ہو جائے)۔ اور یہ بات ہم مذکورہ سطور میں بیان کر چکے ہیں۔

مسئلہ: امام قدوریؒ نے فرمایا: ان میں سے کوئی چیز فروخت نہیں کر سکتے اور نہ انھیں مالی ذخیرہ جمع کرنے کا سبب بنائیں۔ کیونکہ بیع ملک پر مترتب ہوتی ہے

اور اس مال پر ابھی تک کسی کی ملک ثابت نہیں ہوئی ، جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے ۔ اور یہ استعمال تو بطور استباحۃ ہے جیسا کہ طعام کا مباح ہونا ۔

امام قدوریؒ کا **لَا يَتَمَوَّلُوْنَهُ** کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ مال غنیمت کو سونے ، چاندی اور سامان کے عوض بھی فروخت نہ کریں کیونکہ اس کی کوئی ضرورت ہی نہیں ۔ اگر مجاہدین میں سے کوئی فروخت کرے تو اس کی قیمت مال غنیمت میں واپس کر دی جائے گی کیونکہ ایسے مال عین کا بدل ہے جس میں ایک جماعت کا حق ہے ۔

اسی طرح تقسیم سے پہلے بلا ضرورت کپڑوں اور سامان کو ذاتی استعمال میں لانا بھی ناپسندید فعل ہے ، کیونکہ اس میں تمام غازیوں کا مشترکہ حق ہے ۔ ہاں جب مجاہدین کو ضرورت در پیش ہو تو امام دارالحرب ہی میں کپڑوں ، جانوروں اور ضرورۃ کے سامان کی تقسیم کر سکتا ہے ، کیونکہ جب حرام چیز کا استعمال ضرورت کے وقت مباح ہو جاتا ہے تو مکروہ چیز کا استعمال بوقت ضرورت درجۂ اولی جائز ہوگا ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دارالاسلام سے مدد کا آنا تو ایک احتمالی امر ہے ، مگر مجاہدین کی ضرورت ایک یقینی امر ہے تو ان کی رعایت کو مد نظر رکھنا اولی ہے ۔

امام محمدؒ نے ہتھیاروں کی تقسیم کا ذکر نہیں کیا کیونکہ در حقیقت ہتھیار کے اور کپڑے کے درمیان کوئی فرق نہیں ۔ چنانچہ جب کسی غازی کو ضرورۃ در پیش ہو تو اسے

دونوں چیزوں (ثوب و سلاح) سے انتفاع حاصل کرنا مباح ہوگا ۔ اور اگر تمام مجاہدین کو ضرورۃ ہو تو سب میں یہ دونوں چیزیں تقسیم کی جا سکتی ہیں ۔ بخلاف اس کے اگر وہ گرفتار شدہ عورتوں کی ضرورت محسوس کریں تو ان کو تقسیم نہیں کیا جائے گا کیونکہ یہ ضرورت اصلی نہیں بلکہ یہ زائد قسم کی ضرورۃ ہے ۔

مسئلہ : امام قدوریؒ نے فرمایا : کفار میں سے جو شخص دارالحرب میں مشرف باسلام ہوگیا تو اس نے اسلام کی وجہ سے اپنی جان کو بچا لیا ، کیونکہ اسلام کے ہوتے ہوئے ابتداءً غلام بنانا ممکن نہیں ۔ اور اس نے اپنی صغیرہ اولاد کو بھی محفوظ کر لیا ۔ کیونکہ وہ بھی اس کے اسلام کی وجہ سے بالطبع مسلمان شمار ہوں گے ۔ نیز ہر وہ مال جو اس کے قبضے میں ہے وہ بھی محفوظ ہوگا ۔ کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص کسی مال کے ساتھ اسلام لائے تو وہ مال اسی کا ہوتا ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مجاہدین کے قبضہ کرنے سے پہلے اس کا حقیقی قبضہ موجود ہے اور اس کا وہ مال بھی محفوظ ہوگا جو کسی مسلمان یا ذمی کے پاس ودیعۃ و امانۃ کے طور پر پڑا ہے ، کیونکہ اس مال پر محترم قبضہ صحیح ہے اور جس کے پاس امانت پڑا ہے اس کا قبضہ مالک کے قبضے کی طرح ہے ۔

مسئلہ : اگر مسلمان دارالحرب پر غلبہ حاصل کرلیں تو وہاں کا سارا غیر منقولہ مال غنیمت ہوگا اور امام شافعیؒ کا

قول ہے۔ کہ غیر منقولہ بھی اسی کا ہوگا کیونکہ وہ اسی کے قبضے میں ہے تو یہ منقول کی طرح ہوگا۔

ہم کہتے ہیں کہ غیر منقولہ مال اہل ملک اور بادشاہ کے قبضے میں ہوتا ہے، کیونکہ یہ اراضی بھی دارالحرب ہی کا حصہ ہے تو حقیقۃً اس کے قبضہ میں نہ رہا۔ بعض حضرات نے کہا کہ متن میں مذکور مسئلہ امام ابو حنیفہؒ کی رائے ہے اور امام ابو یوسفؒ بھی دوسرے قول کے مطابق ان سے متفق ہیں۔ امام محمدؒ کے قول اور امام ابو یوسفؒ کے پہلے قول کے مطابق مال غیر منقولہ بھی دوسرے اموال کی طرح ہے۔ اس اختلاف کی بناء یہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک غیر منقولہ مال پر حقیقی قبضہ ثابت نہیں ہوتا اور امام محمدؒ کے نزدیک ہو جاتا ہے۔

مسئلہ: اس ذو مسلم کی بیوی بھی مال غنیمت میں شامل ہوگی کیونکہ وہ حربیہ کافرہ ہے جو اسلام میں اپنے شوہر کے تابع شمار نہ کی جائے گی۔ اسی طرح اس کا حمل بھی غنیمت میں داخل ہوگا۔ امام شافعیؒ کو اس سے اختلاف ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ وہ والد کے تابع ہو کر مسلمان ہوگا جیسے کہ پیدا شدہ چھوٹے بچے باپ کے تابع شمار کیے جاتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ حمل عورت کا جزء ہے اس کے غلامی میں آنے سے وہ بھی غلامی میں آ جائے گا اور مسلمان میں بھی امکان ہوتا ہے کہ وہ یہ غیر کا تابع ہو کر مملوک بن جائے۔ (مثلاً مسلمان دوسرے کی لونڈی سے شادی کرے تو اس کا

بچہ لونڈی کے تابع ہو کر غلام ہوگا اور دین میں اپنے باپ کے تابع ہو کر مسلمان ہوگا) ۔ بخلاف اس بچے کے جو پیدا ہو چکا ہے ۔ چونکہ وہ آزاد ہے کیونکہ ماں کے پیٹ سے الگ ہونے کے بعد وہ جزئیۃ باقی نہ رہی ۔

نو مسلم کی بڑی اولاد بھی مال غنیمت ہوگی کیونکہ وہ حربی کافر ہیں اور ان کے بارے میں تابع ہونے کا اعتبار نہیں کیا جائے گا اور اس کے غلاموں سے جو لڑائی میں شامل ہوئے وہ بھی مال غنیمت ہوں گے ۔ کیونکہ جب انھوں نے اپنے آقا کے خلاف سرکشی اختیار کی تو اس کے قبضہ سے جاتے رہے اور اہل دار یعنی اہل حرب کے تابع شمار ہوں گے ۔

اس نو مسلم کا جو مال حربی کے قبضہ میں ہوگا وہ بھی مال غنیمت ہوگا ۔ حربی کے پاس غصب کی صورت میں ہو یا امانت کے طور پر کیونکہ حربی کا قبضہ محترم نہیں ہے ۔

اور جو مال کسی مسلمان یا ذمی کے قبضے میں بطور غصب ہو وہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک غنیمت ہوگا ۔ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ غنیمۃ نہ ہوگا ۔ مصنف علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ امام محمدؒ نے السیر الکبیر میں اس اختلاف کا اسی طرح ذکر کیا ہے (اور امام ابو یوسفؒ کے متعلق کوئی ذکر نہیں) ۔ اور جامع صغیر کے شارحین نے امام ابو یوسفؒ کا قول امام محمدؒ کے مطابق ذکر کیا ہے اور صاحبینؒ کی دلیل یہ ہے کہ مال نفس کے تابع ہوتا ہے اور نفس قبول اسلام کی وجہ سے عصمت حاصل کر چکا ہے ۔ تو مال بھی اس میں اس

کے تابع ہو کر محترم ہو جائے گا ۔

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں : اصل کے لحاظ سے وہ مال مباح تھا (کیونکہ مسلمان یا ذمی نے اس سے اس وقت چھین لیا تھا جب کہ وہ حربی تھا اور مال محترم نہ تھا بلکہ مباح تھا) ، تو غلبہ کی وجہ سے ملک میں آ جائے گا ۔ اور نفس اسلام لانے کی بناء پر معصوم نہیں ہو جاتا کیا آپ دیکھتے نہیں کہ اس کا نفس کوئی قیمت والی چیز نہیں ہے ۔ البتہ اس سے تعرض کرنا اصل کے لحاظ سے حرام ہے ۔ کیونکہ وہ مکلف ہے ۔ (یعنی اللہ تعالی نے انسان کو اطاعت احکام کی تکلیف دی ہے اور اس تکلیف کو وہ اسی صورت میں پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتا ہے جب کہ اسے زندہ رہنے کا حق دیا جائے اور اس سے تعرض نہ کیا جائے) ؛ اور انسان سے تعرض کا مباح ہونا اس کے عارضۂ شر کی وجہ سے ہوتا ہے (یعنی جنگ میں انسانوں کا قتل ان کے کفر اور فتنہ و فساد کی بناء پر مباح ہوتا ہے ورنہ اصل کے لحاظ سے تو انسانی زندگی سے تعرض ممنوع ہے) ۔ اور وہ شر کا عارضہ تو اسلام لانے کی بناء پر ختم ہوگیا ۔ (لہذا اب اس سے تعرض جائز نہ ہوگا ۔ آپ کی بات ثابت نہ ہوسکی کہ انسان اسلام کی وجہ سے معصوم ہو جاتا ہے ، کیونکہ نفس کوئی قیمتی چیز نہیں کہ اسے عصمت حاصل ہو اور یہ عصمت بھی دارالاسلام میں حاصل ہوتی ہے ۔ لہذا دارالحرب میں اگر اسے کوئی مسلمان عمداً یا خطاً قتل کردے تو نہ قصاص واجب ہوگا اور نہ دیة) ، اور مال کی نوعیة اس

سے الگ ہے ، کیونکہ اسے تو خرچ کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور وہ ملک میں آنے کے قابل ہوتا ہے اور حکماً چونکہ اس کے قبضے میں نہیں ہے لہذا وہ مال محترم نہ بن سکے گا .

مسئلہ : جب مسلمان دارالحرب سے نکل آئیں تو مال غنیمت سے نہ تو جانوروں کو چارا ڈالنا جائز ہے اور نہ خود ہی کھا سکتے ہیں . کیونکہ اب ضرورت باقی نہیں رہی اور اباحة ضرورة کے پیش نظر تھی . دوسری بات یہ ہے کہ اب مسلمانوں کا حق پختہ اور مضبوط ہوگیا ہے ، حتی کہ مرحوم مجاہد کا حصہ میراث بن جائے گا . لیکن دارالاسلام میں لانے سے پہلے یہ بات نہ تھی اور اس کے پاس جو چارہ یا طعام بچ جائے وہ مال غنیمت میں داخل کرا دے . اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تقسیم نہ کیا گیا ہو (بلکہ مال مشترک سے ہو) . امام شافعیؒ کا ایک قول تو ہمارے مطابق ہے اور ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ واپس نہ کیا جائے جیسا کہ متلصص کی صورۃ میں ہوتا ہے . (متلصص سے مراد یہ ہے کہ ایک یا دو شخص امام کی اجازۃ کے بغیر دارالحرب میں گھس جائیں اور وہاں سے کچھ چرا کر لے آئیں تو وہ سامان ان کی ملکیۃ بن جائے گا ، اس سے خمس نہیں نکالا جائے گا کیونکہ وہ مال غنیمت نہیں ہے) .

ہماری دلیل یہ ہے کہ یہ اختصاص تو حاجة کی ضرورة

کے پیش نظر تھا اور اب ضرورۃ زائل ہو چکی ہے۔ (یعنی یہ مال مجاہد کے لیے اسی وقت تک خاص تھا جب تک اس کی ضرورۃ باقی تھی، مگر اب ضرورۃ نہ رہی تو اس کا اختصاص بھی جاتا رہا اور یہ مال، مال غنیمت میں واپس کیا جائے گا)۔ بخلاف متلصص کے کیونکہ وہ تو دارالاسلام میں لانے سے پہلے بھی اس کا حق دار تھا تو اب دارالاسلام میں لانے کے بعد بھی حق دار ہوگا۔

مسئلہ: اگر دارالحرب میں امام نے یہ غلہ اور چارا تقسیم کیا ہو (تو اب مال غنیمت میں شامل کرنا ضروری نہیں بلکہ) اگر غنی ہوں تو یہ غلہ اور چارا صدقہ کر دیں، اور اگر خود ضرورت مند اور محتاج ہوں تو خود نفع اٹھائیں۔ کیونکہ یہ غلہ لقطہ کے حکم میں ہوگا اس لیے کہ اب مجاہدین کو واپس کرنا متعذر ہے (کیونکہ مجاہدین تو اپنے اپنے گھروں کو جا چکے ہیں۔ لقطہ وہ مال ہے جو راستے میں گرا پڑا مل جائے اس کے مفصل احکام آگے آ رہے ہیں)۔

اگر دارالاسلام میں لانے کے بعد اس سے نفع اٹھائیں تو اس کی قیمت مال غنیمت میں داخل کریں بشرطیکہ امام نے تقسیم نہ کی ہو۔ اگر غنیمت کی تقسیم ہو چکی ہو تو غنی شخص اس کی قیمت کے مطابق صدقہ کر دے اور محتاج پر کچھ واجب نہ ہوگا۔ کیونکہ قیمت اصل کے قائم مقام ہوتی

ہے ۔ لہذا قیمت پر بھی اصل کا حکم ہی جاری ہوگا (یعنی اگر اس کے پاس اصل چیز یعنی غلہ موجود ہوتا تو بھی وہ اپنی ذات پر بوجہ غربت خرچ کر سکتا تھا اور جو اصل کے قائم مقام ہے ۔ یعنی قیمت وہ بھی اپنے اوپر ہی خرچ کرسکتا ہے ۔ لہذا اس پر قیمت کا صدقہ واجب نہ ہوگا) ۔

فَصْلٌ فِىْ كَيْفِيَّةِ الْقِسْمَةِ

تقسیم کی کیفیت کے بیان میں

مسئلہ : امام قدوریؒ نے فرمایا : امام غنیمت کی تقسیم کا کام سرانجام دے اور پانچواں حصہ الگ کرلے . اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْيَتَامٰی وَالْمَسَاكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ . (الانفال : ۴۱) اور تمھیں معلوم ہو کہ جو کچھ مال غنیمة تم نے حاصل کیا ہے اس کا پانچواں حصہ اللہ اور رسول اور رشتہ داروں اور یتیموں ، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے . اس آیة میں مال غنیمة کی تقسیم کا قانون بتایا ہے کہ لڑائی کے بعد تمام سپاہی ہر طرح کا مال غنیمة لا کر امیر یا امام کے سامنے رکھ دیں اور کوئی چیز چھپا کر نہ رکھیں اور پانچواں حصہ ان اغراض کے لیے نکال لیا جائے جو آیة میں بیان ہوئی ہیں اور باقی چار حصے ان سب لوگوں میں تقسیم کر دیے جائیں جنھوں نے جنگ میں حصہ لیا . چنانچہ اس آیة کے مطابق نبی ﷺ ہمیشہ لڑائی کے بعد اعلان فرمایا کرتے تھے: ”یہ غنائم تمھارے ہی لیے ہیں . میری اپنی ذات کا ان میں

کوئی حصہ نہیں جز خمس کے اور وہ خمس بھی تمہارے ہی اجتماعی مصالح پر صرف کر دیا جاتا ہے"۔

اس تقسیم میں اللہ اور رسول کا حصہ ایک ہی ہے اور اس سے مقصود یہ ہے، کہ خمس کا ایک جزء اعلاء کلمۃ اللہاور اقامۃ دین حق کے کام میں صرف کیا جائے۔ (تفہیم القرآن)۔ آیۃ میں خمس کو مستثنیٰ کیا گیا ہے (کہ تقسیم غنیمۃ سے پہلے خمس الگ کر لیا جائے) اور باقی کے چار حصے (یعنی ۴/۵ مجاہدین میں تقسیم کر دیے جائیں۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے ان چار حصوں کو مجاہدین میں تقسیم فرمایا تھا۔

مسئلہ: غنیمۃ میں سوار کے دو حصے اور پیدل کا ایک حصہ ہے یہ امام ابو حنیفہؒ کی رائے ہے۔ صاحبینؒ کا کہنا ہے کہ سوار کے تین حصے ہیں۔ اور امام شافعیؒ کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سوار کو تین حصے دیے اور پیدل کو ایک حصہ۔ دوسری بات یہ ہے کہ غنیمۃ کا استحقاق کفایۃ کے مطابق ہوتا ہے (یعنی جنگ میں جس قدر کفایۃ جس سے حاصل ہوگی اتنا ہی حصہ اسے ملے گا)۔ اور سوار پیدل کی بہ نسبت تین گنا کفایۃ دیتا ہے۔ کیونکہ سوار آگے بڑھ کر حملہ کرتا ہے، تیزی سے پیچھے ہٹ سکتا ہے اور اپنی جگہ پر قائم رہ کر لڑتا ہے اور پیدل صرف اپنی جگہ پر ثابت رہ کر لڑتا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ اپنی تائید میں حضرت عبداللہ بن عباس

کی روایۃ پیش کرتے ہیں ۔ کہ نبی اکرم ﷺ نے سوار کو دو حصے اور پیدل کو ایک حصہ دیا ۔ مذکورہ دونوں روایتوں کے مد نظر آپ ﷺ کے دو فعلوں میں تعارض آگیا لہذا آپ ﷺ کے قول کی طرف رجوع کیا جائے گا ۔ اور حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ سوار کے دو حصے ہیں اور پیدل کا ایک ۔ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ ابن عمرؓ کے قول سے کیسے استدلال کر سکتے ہیں ۔ جب کہ ابن عمرؓ سے یہ روایۃ موجود ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے تقسیم میں سوار کو دو حصے دیے اور پیدل کو ایک ۔ تو جب ابن عمرؓ کی اپنی روایات میں تعارض موجود ہوا تو کسی دوسرے کی روایۃ کو ترجیح ہوگی ۔ نیز کر اور فر کی (یعنی آگے بڑھ کر یا پیچھے ہٹ کر حملہ کرنا) ایک ہی جنس ہے ۔ (یہ الگ الگ امور شمار نہ ہوں گے) ۔ پس سوار کی کفایۃ بھی پیدل کی کفایۃ کی طرح ہوگی ۔ البتہ پیدل کی بہ نسبت سوار سے لڑائی میں دو چند نفع ہے ۔ لہذا پیدل سے اسے ایک حصہ زیادہ ملے گا ۔ نیز زیادہ کی مقدار کا تعین مشکل ہے (کہ سوار نے کس قدر کام کیا اور پیدل نے کس قدر اور دونوں کی کارکردگی میں کتنا فرق تھا) کیونکہ اس کا صحیح طور پر علم نہیں ہو سکتا ۔ تو حکم کا مدار سبب ظاہر پر ہوگا اور سوار کے دو سبب ہیں : اپنی جان اور گھوڑا ۔ اور پیدل کا ایک سبب ۔ تو سوار کا حق پیدل سے دگنا ہوگا ۔

مسئلہ : امام قدوریؒ نے فرمایا : مجاہد کو صرف ایک

گھوڑے کا حصہ دیا جائے گا ۔ امام ابو یوسفؒ کی رائے میں دو گھوڑوں کا حصہ دیا جائے گا ۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے دو گھوڑوں کا حصہ دیا تھا ۔ دوسری بات یہ ہے کہ ایک گھوڑا کبھی لڑائی کے قابل نہیں رہتا ۔ لہذا دوسرے کی ضرورت در پیش آ جاتی ہے ۔

امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کی دلیل یہ ہے کہ حضرت براء بن اوسؓ دو گھوڑے لے کر گئے تھے ۔ مگر رسول کریم ﷺ نے صرف ایک گھوڑے کا حصہ دیا تھا ۔ دوسری بات یہ ہے کہ جنگ میں دونوں گھوڑے یکبارگی استعمال میں نہیں لائے جاتے تو حصہ پانے کا ظاہری سبب یعنی دو گھوڑے لے کر میدان جنگ میں جانا دونوں پر سوار ہو کر جنگ کرنے کو ثابت نہیں کرتا ، لہذا ایک گھوڑے کا حصہ ملے گا ۔ اسی بناء پر تین گھوڑوں کا حصہ نہیں ملتا اور آپ نے جو روایة پیش کی ہے وہ تفضیل پر محمول ہے ۔ یعنی آپ ﷺ نے بطور نفل ایک حصہ مزید دے دیا ۔ جیسا کہ آپ ﷺ نے سلمہ بن اکوعؓ کو دو حصے دیے تھے حالیکہ وہ پیدل تھے ۔

مسئلہ : امام قدوریؒ نے فرمایا کہ عجمی اور عربی دونوں گھوڑے برابر ہیں ۔ کیونکہ کتاب اللہ میں ارھاب یعنی خوف دلانا جنس خیل کی طرف مضاف ہے ۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے : **وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهِ عَدُوَّ اللهِ وَعَدُوَّكُمْ** (الانفال : ٦٥) ۔ اور تم لوگ، جہاں تک تمہارا بس چلے ، زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار

بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلے کے لیے مہیا رکھو تاکہ اس کے ذریعے سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو خوف زدہ کر دو . آیة میں خیل سے مراد گھوڑے کی جنس ہے ، ترکی یا عربی کوئی خاص قسم کا گھوڑا مراد نہیں) . اور گھوڑے کا لفظ ترکی النسل ، عربی النسل یا ماں کی طرف سے عربی اور باپ کی طرف سے ترکی گھوڑے پر ایک ہی طرح بولا جاتا ہے . عربی گھوڑا اگرچہ تعاقب کرنے اور پیچھے ہٹنے کے لحاظ سے طاقت ور ہوتا ہے . تو ترکی النسل گھوڑے میں تحمل شدائد کا مادہ زیادہ ہوتا ہے اور وہ موڑنے میں آسان ہوتا ہے . ہر نسل میں کوئی نہ کوئی مخصوص منفعة پائی جاتی ہے لہذا سب گھوڑے برابر ہوں گے .

مسئلہ : جو شخص دارالحرب میں سوار ہو کر داخل ہو . لیکن اس کا گھوڑا مر جائے تو وہ سوار کے حصے کا مستحق ہوگا . اور جو شخص دارالحرب میں پیدل داخل ہو ، لیکن وہاں جا کر گھوڑا خرید لے تو اسے پیدل کا حصہ ملے گا . اور امام شافعیؒ کا جواب دونوں صورتوں میں برعکس ہے . عبداللہ بن مبارکؒ نے بھی امام ابو حنیفہؒ کا قول اسی طرح نقل کیا ہے کہ دوسری صورة میں اسے سوار کا حصہ ملے گا .

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ہمارے نزدیک دارالحرب میں داخل ہونے کی حالة کا اعتبار کیا جاتا ہے اور امام شافعیؒ کے نزدیک جنگ ختم ہونے کی حالة معتبر ہے . امام شافعیؒ

کی دلیل یہ ہے کہ استحقاق غنیمۃ کا سبب قہر و قتال ہے ، تو مجاہد کی جنگ کے وقت کی حالۃ کا اعتبار ہوگا ۔ سرحد پار کرنے کی حالۃ تو سبب کے حصول کے لیے وسیلہ ہوتا ہے ۔ جیسے کہ گھر سے نکلنا (یعنی گھر سے نکلتے وقت جنگ کی نیۃ کرکے نکلنا ۔ تو چونکہ یہ بھی سبب کا وسیلہ ہوتا ہے لہذا اس حالۃ کا اعتبار نہیں کیا جاتا) ۔ قتال کے ساتھ احکام کا متعلق کرنا قتال کے وقوف و معرفۃ کی دلیل ہے ۔ اگر یہ معرفۃ متعذر یا مشکل ہو تو ان لوگوں کی شہادۃ کے ساتھ احکام متعلق ہوں گے جو معرکۂ قتال میں موجود ہیں ۔ کیونکہ یہ قتال سے زیادہ قریب ہوتے ہیں ۔ (یعنی جو مجاہدین اس کے ساتھ جنگ میں شامل ہوں ان سے پتا چل سکتا ہے کہ یہ سوار ہو کر جنگ کر رہا تھا یا کہ پیدل تھا ۔ اول تو ہمیں مجاہد کے بیان ہی پر یقین کر لینا چاہیے ، لیکن بحالت شک ساتھ والوں کی گواہی لی جا سکتی ہے) ۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ سرحد پار کرنا ہی قتال ہے ۔ کیونکہ عبور سرحد سے دشمنوں کو خوف لاحق ہو جاتا ہے اور عبور کے بعد تو دوام قتال کی حالۃ ہوتی ہے اور اس کا اعتبار کرنا شرط نہیں ۔ (یعنی میدان جنگ میں تو دوام قتال کی حالۃ ہوتی ہے کیونکہ سوار کے لیے یہ ممکن نہیں رہتا کہ وہ گھوڑے پر بیٹھ کر ہی لڑتا رہے ۔ دست بدست جنگ کی صورۃ میں گھوڑے سے اترنا پڑتا ہے اور گواہ ممکن ہے اسی حالۃ کی گواہی دیں ۔ تو یہ حقیقۃ کے خلاف بھی ہو سکتی

ہے). دوسری بات یہ ہے کہ حقیقۃ قتال کی پوری معرفۃ تو مشکل بلکہ ناممکن ہے اور یہی حال دوسرے لوگوں کا ہوگا جو مصروف پیکار ہیں ، اور دونوں صفیں باہم ٹکرا چکی ہیں تو دوسرے کی حالۃ مشاہدہ کرنے کا کسے ہوش ہوگا) لہذا عبور سرحد کی حالۃ کو حاضرین قتال کے قائم مقام کیا جائے گا. (جیسا کہ سفر کو مشقت کے قائم مقام ٹھیرایا جاتا ہے) کیونکہ عبور سرحد ہی وہ ظاہری سبب ہے جو قتال تک پہنچانے والا ہے. بشرطیکہ اس نے نیۃ قتال سے سرحد عبور کی ہو. پس سرحد کے عبور کرنے کے وقت کی حالۃ کا اعتبار ہوگا کہ وہ سوار ہے یا پیدل. اگر سوار ہو کر داخل ہوا مگر تنگ جگہ کی وجہ سے اسے گھوڑے سے اتر کر لڑنا پڑا تو بالاتفاق دو حصوں کا مستحق ہوگا.

اگر سوار ہو کر دارالحرب میں داخل ہو پھر اپنا گھوڑا فروخت کر دے یا ھبہ کر دے یا کرائے پر دے دے یا کسی مجاہد کے پاس رہن رکھ دے ، تو امام حسنؒ سے مروی امام ابو حنیفہؒ کی رائے کے مطابق عبور سرحد کا لحاظ کرتے ہوئے اسے دو حصے ملیں گے اور ظاھر الراویۃ کے مطابق پیدل کے حصے کا مستحق ہوگا. کیونکہ ان تصرفات (یعنی بیع یا ھبہ یا کرایہ یا رہن) پر اقدام کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا سرحد عبور کرنا سوار ہو کر جنگ کرنے کے قصد سے نہ تھا.

اگر جنگ کے بعد گھوڑا فروخت کر دے تو اس کے

دو حصے ساقط نہ ہوں گے اور بعض کے نزدیک اگر دوران جنگ بھی بیچ دے تو اس کے دو حصے ہوں گے . لیکن صحیح یہ ہے کہ اس کا دوسرا حصہ ساقط ہو جائے گا . کیونکہ بیچنا اس امر کی دلیل ہے کہ اس کی غرض تجارۃ تھی اور اس امر کا منتظر تھا کہ جنگ شروع ہو تو گھوڑے کی قیمت بڑھ جائے .

مسئلہ : مملوک ، عورت ، بچے ، مجنون اور ذمی کا حصہ مال غنیمۃ سے نہیں نکالا جائے گا . لیکن امام اپنی صوابدید اور رائے کے مطابق کچھ تھوڑا بہت گزارے اور کھانے کے لیے دے گا . جیسا کہ آنحضرت ﷺ سے مروی ہے کہ آپ عورتوں ، بچوں اور غلاموں کا حصہ نہیں نکالتے تھے لیکن انہیں کھانے کے لیے کچھ مرحمت فرما دیا کرتے . نیز جب آپ ﷺ نے مدینہ کے یہود سے خیبر کے یہود کے خلاف مدد لی تھی تو مدینہ کے یہود کو غنیمۃ سے کچھ نہ دیا یعنی آپ نے ان کا حصہ مقرر نہ فرمایا .

دوسری بات یہ ہے کہ جہاد عبادۃ ہے اور ذمی عبادۃ کی اھلیۃ سے محروم ہوتا ہے . بچہ اور عورت جہاد میں شریک ہونے سے عاجز ہوتے ہیں . اس لیے ان پر جہاد کرنا فرض نہیں . اور غلام کو آقا اجازت نہیں دیتا اور آقا کو روکنے کا حق بھی ہے . البتہ غلاموں کو امام کچھ نہ کچھ دے دے تاکہ انہیں جہاد میں رغبت ہو . لیکن ان کے رتبے کی کمی کا اظہار ملحوظ رہے (یعنی انہیں مجاہدین کے مساوی

حصہ نہ دے) ۔ اور مکاتب بھی عام غلام کی طرح ہے ۔ کیونکہ اس کے بارے میں غلامی قائم ہے ۔ نیز یہ احتمال بھی ہے کہ وہ کتابۃ کا معاوضہ ادا کرنے سے قاصر ہو تو آقا اسے میدان جنگ کی طرف جانے سے روک سکتا ہے ۔

اگر غلام جنگ میں شرکۃ کرے تو اسے ضرور کچھ نہ کچھ دیا جائے ۔ یعنی وہ دراصل تو اپنے آقا کی خدمت کے مد نظر دارالحرب میں آیا تھا تو یہ تاجر کی طرح ہوگا ۔ (چونکہ اس نے جنگ میں بالفعل شرکۃ کی ہے اس لیے کچھ نہ کچھ اسے ضرور دیا جائے) ۔

اگر عورت نے میدان جنگ میں زخمیوں کی مرہم پٹی کی ہو اور مریضوں کی نگہداشت کی ہو تو اسے بھی کچھ نہ کچھ دیا جائے ۔ کیونکہ وہ قتال حقیقی سے تو عاجز ہے ۔ مگر اس کی یہ خدمۃ و اعانۃ قتال کے قائم مقام ہوگی ۔ بخلاف غلام کے کہ وہ تو قتال حقیقی پر قادر ہوتا ہے ۔

ذمی نے اگر جنگ میں حصہ لیا ہو یا جنگ میں حصہ نہ لیا ، مگر مسلمانوں کو صحیح راستوں سے آگاہ کیا ہو تو اسے بھی کچھ نہ کچھ دیا جائے گا ۔ کیونکہ اس کے فعل میں مسلمانوں کی منفعۃ ہے ۔ اگر ذمی کی راہنمائی کی وجہ سے مسلمانوں کو بہت بڑا نفع پہنچے تو اسے مجاہدین کے حصے سے سے زیادہ بھی دیا جا سکتا ہے ۔ لیکن اگر صرف جنگ میں شریک ہوا ہو تو اسے غازی کے حصے سے کم دیا جائے گا ۔ راہنمائی کرنا عمل جہاد سے نہیں ۔ (لہذا اس کا معاوضہ اس

کی خدمۃ کے مطابق کم و بیش دیا جا سکتا ہے، اور حکم جہاد میں اسے مسلمان کے برابر حصہ نہیں دیا جائے گا) ۔

مسئلہ : اور خمس یعنی غنیمۃ کا پانچواں حصہ تین حصوں میں منقسم ہوگا ۔ ایک حصہ یتیموں کے لیے ایک حصہ مساکین کے لیے اور ایک حصہ مسافروں کے لیے ۔ اس حصے میں آنحضرت ﷺ کے محتاج اہل قرابۃ بھی داخل ہوں گے اور اس حصے میں انہیں مقدم رکھا جائے گا اور دولت مند اہل قرابۃ کو نہیں دیا جائے گا ۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اہل قرابۃ کو خمس کا پانچواں حصہ دیا جائے گا اور اس میں فقیر و امیر سب برابر کے حصہ دار ہوں گے ۔ البتہ ہر مرد کو دو عورتوں کے برابر حصہ ملے گا اور قرابت داروں میں صرف بنی هاشم اور بنی مطلب شامل ہوں گے دوسرے نہیں (بنی عبد شمس اور بنی نوفل شامل نہ ہوں گے) کیونکہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے : وَلِذِي الْقُرْبٰى مطلق ہے جس میں امیر یا غریب کی کوئی تخصیص نہیں ۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ خلفاء راشدین نے اسی طرح تین حصوں میں تقسیم فرمائی تھی ۔ جس طرح ہم نے بتائے ہیں اور ان کے اسوۂ حسنہ کی اقتداء ہمارے لیے کافی ہے ۔ نیز نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے : اے گروہ بنی ہاشم اللہ تعالی نے تمہارے لیے لوگوں کا میل کچیل ناپسند فرمایا (یعنی تم پر زکاۃ اور صدقہ ناجائز قرار دیا) ، اور اس کے عوض تمہیں

خمس کا خمس عنایة فرما دیا۔ اور عوض انہیں لوگوں کے حق میں ثابت ہوتا ہے جن کے حق میں معوض (یعنی صدقہ و زکاۃ ثابت ہو اور یہ صرف محتاج حضرات ہیں۔ البتہ نبی اکرم ﷺ نے بنو ہاشم کے ساتھ بنو مطلب کو نصرۃ و اعانۃ کی بناء پر دیا۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اس کی یہ دلیل دی کہ یہ لوگ زمانۂ جاہلیة و اسلام میں برابر میرے ساتھ اسی طرح رہے اور آپ نے دونوں کی انگلیوں کو آپس میں جوڑ دیا۔ (یعنی بنی ہاشم اور بنی مطلب ایک ہی شے ہیں) آپ کا یہ ارشاد اس بات کی دلیل ہے کہ نص میں وَلِذِی الْقُرْبٰی سے مراد قربة نسبی نہیں بلکہ قربة نصرت ہے۔

مسئلہ: امام قدوریؒ نے فرمایا: خمس کے ابتداء میں اللہ تعالی کے ذکر سے اسم پاک کے ساتھ تبرک کے طور پر افتتاح کرنا مقصد ہے اور آنحضرت ﷺ کا حصہ آپ ﷺ کی وفات سے ساقط ہوگیا۔ جیسے کہ صفی بالاتفاق ساقط ہے۔ (صفی سے مراد یہ ہے کہ تقسیم غنیمة سے قبل آپ کوئی تلوار، زرہ یا جاریہ اپنے لیے پسند فرما لیتے۔ حضرت صفیہ کا انتخاب آپ ﷺ نے ایسے ہی فرمایا تھا۔ آپ ﷺ کے بعد یہ حق کسی کو نہیں ہے) کیونکہ نبی اکرم ﷺ رسالة کی بناء پر اس کے مستحق تھے اور آپ کے بعد رسالة کا دروازہ تو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا۔ صفی سے مراد وہ شے ہے جو آنحضرت ﷺ غنیمة سے اپنے لیے مخصوص فرما لیا کرتے تھے مثلاً تلوار، زرع یا لونڈی۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں : رسول اللہ ﷺ کا حصہ خلیفہ کو دیا جائے گا ۔ لیکن جو کچھ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں وہ ان کے خلاف حجۃ ہے (یعنی خلفاء نے خود یہ حصہ وصول نہیں کیا تھا نیز آپ کا حصہ رسالۃ کی بناء پر تھا) ۔

اھل قرابۃ نبی اکرم ﷺ کے دور مبارک میں نصرت کی بناء پر اس حصے کے مستحق تھے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں ۔ امام قدوریؒ نے فرمایا : حضور ﷺ کی وفات کے بعد وہ احتیاج کی وجہ سے مستحق ہوں گے ۔ مصنف علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ امام قدوری رحمہ اللہ نے جو ذکر کیا ہے یہ امام کرخی رحمہ اللہ کا قول ہے ۔ امام طحاوی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ان کے فقراء کا حصہ بھی ساقط ہے ۔ اس اجماع کی بناء پر جس کا ذکر ہم نے کیا ہے (یعنی خلفاء راشدین نے صرف تین حصے ہی کیے اور قرابۃ داروں کا حصہ نہیں نکالا ۔ اگر بطور صدقہ دیا جائے تو بھی جائز نہیں کیونکہ بنی ھاشم پر صدقہ حرام ہے) ۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس حصہ میں مصرف کے مدنظر صدقہ کا پہلو آ جاتا ہے ، اور اھل قرابۃ پر تو صدقہ بھی حرام ہے ۔ جیسا کہ ھاشمی عامل کے لیے ایسا مال لینا حرام ہے ۔

اور پہلے قول کی وجہ ۔ اور یہی قول صحۃ کے زیادہ قریب ہے : یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے فقراء کو دیا تھا اور اجماع

خلفاء راشدین سے تو ان کے امراء کا حصہ ساقط ہوا تھا۔ لیکن ان کے فقراء اصناف ثلاثہ میں شامل ہیں۔

مسئلہ : جس وقت ایک یا دو شخص امام کی اجازت کے بغیر غارت گری کی غرض سے دارالحرب میں داخل ہوں اور وہاں سے کچھ مال لے آئیں تو اس سے خمس نہیں نکالا جائے گا۔ کیونکہ غنیمۃ اس مال کو کہا جاتا ہے جو زبردستی اور غلبے سے لیا جائے اس میں وہ شامل نہیں ہوتا جو اچک کر یا چرا کر لایا جائے اور خمس تو مال غنیمۃ کا وظیفہ یعنی معمول ہے۔

اگر ایک یا دو شخص امام کی اجازۃ سے دارالحرب میں داخل ہوں تو اس میں دو روایتیں ہیں جن میں سے مشہور یہ ہیں کہ ان کے لائے ہوئے مال سے خمس لیا جائے گا۔ کیونکہ جب امام نے انہیں اجازۃ دے دی تو اس نے گویا مددگاروں کے ذریعے ان کی مدد کا التزام کرلیا، تو یہ ایک یا دو شخص ایک ایسی جماعۃ کے قائم مقام ہوں گے جن کو مرکز کی حمایۃ حاصل ہے۔

مسئلہ : امام قدوریؒ نے فرمایا : اگر دارالحرب میں ایسی جماعۃ داخل ہو جن کو قوۃ منعۃ حاصل ہے اور وہ کچھ مال لے کر آئیں تو اس سے خمس نکالا جائے گا۔ خواہ امام کی اجازۃ بھی انہیں حاصل نہ ہو۔ کیونکہ یہ مال زبردستی اور غلبہ سے لیا گیا ہے پس غنیمۃ شمار ہوگا۔ دوسری

بات یہ ہے کہ ان کی مدد کرنا امام پر واجب ہے۔ کیونکہ اگر انہیں نظر انداز کر دے اور بے یار و مددگار چھوڑ دے تو اس سے مسلمانوں کے حق میں ضعف لازم آتا ہے۔ بخلاف ایک یا دو آدمیوں کے کہ ان کی مدد کرنا امام پر واجب نہیں ہے۔

فَصْلٌ فِي التَّنْفِيْلِ

حصے سے زائد دینے کے بیان میں

مسئلہ : امام قدوریؒ نے فرمایا : اس بات میں کوئی قباحۃ نہیں کہ امام کفار کے ساتھ جنگ کے وقت تنفیل کا اعلان کرے اور انہیں خوب خوب لڑنے پر آمادہ کرے. مثلاً یوں کہے جو کسی کافر کو قتل کرے گا اس کا سارا سامان اسی کی ملکیۃ ہوگا. یا چھوٹے دستے کو کہے کہ خمس نکالنے کے بعد ایک چوتھائی تمہیں بطور نفل دوں گا. اس کا مطلب یہ ہے خمس الگ کرلینے کے بعد بچے ہوئے مال کی چوتھائی. کیونکہ لڑنے پر آمادہ کرنا مستحب ہے. اللہ تعالی کا ارشاد ہے : يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ - (الانفال : ٦٥) اے نبی! مؤمنوں کو جنگ پر ابھارو. اور یہ تنفیل بھی تحریض ہی کی ایک قسم ہے. کبھی تو تنفیل امام قدوریؒ کے ذکر کردہ طریق سے ہوتی ہے اور گاہے اس کے بغیر ہوتی ہے (مثلاً سونا چاندی دینے کا وعدہ کرے) البتہ امام کے لیے یہ مناسب نہیں کہ پورا مال غنیمۃ تنفیل میں دے دے. کیونکہ اس سے دوسروں کے

حق کا ابطال لازم آتا ہے ۔ ہاں اگر چھوٹے دستے کے ساتھ ایسا کرے (کہ جو کچھ تم حاصل کرو تمھارا ہوگا) تو جائز ہے ۔ کیونکہ اسے تصرف کا اختیار حاصل ہے اور گاہے اس میں مصلحة بھی مضمر ہوتی ہے ۔

مال غنیمة کو دارالاسلام میں لانے کے بعد تنفیل نہیں ہو سکتی ۔ کیونکہ دارالاسلام کی حفاظت میں آ جانے کے بعد دوسروں کا حق پختہ ہو جاتا ہے ۔

مسئلہ : امام قدوری رحمه الله نے فرمایا : خمس سے تنفیل جائز نہیں ، کیونکہ مجاہدین کا خمس میں کوئی حق نہیں ہوتا ۔ اگر امام کافر مقتول کا سامان قاتل کو نہ دے تو وہ بھی مال غنیمة میں شمار ہوگا ۔ قاتل اور دوسرے اس میں برابر کے شریک ہوں گے ۔ امام شافعی رحمه الله فرماتے ہیں کہ سلب (مقتول کا سامان) قاتل کے لیے ہوتا ہے ، بشرطیکہ قاتل ان لوگوں سے ہو جو حصہ لینے کی اهلیة رکھتے ہیں اور اس نے کافر کو اس کے حملہ کرنے کی صورة میں قتل کیا ہو ۔ حضور صلی الله علیه وسلم کا ارشاد ہے کہ جس نے کسی کافر کو مارا تو اس کا سامان قاتل کو ملے گا ۔ اور یہ ظاہر ہے کہ آپ نے ایک شرعی اصول بیان فرمایا ۔ کیونکہ آپ اسی لیے مبعوث ہوئے تھے ۔ نیز آگے بڑھ کر حملے کرنے والے کافر کا قاتل کفایة اور نفع کے لحاظ سے اہم ہوتا ہے ۔ تو مقتول کا سامان بطور خاص اسے دیا جائے گا تاکہ اس کے اور دوسرے کے درمیان فرق ظاہر ہو جائے ۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ یہ سامان لشکر کی قوة یہ طاقة سے لیا گیا ہے ، پس غنیمة میں شمار ہوگا اور اس کی تقسیم بھی مال غنیمة کی تقسیم کی طرح ہوگی جیسا کہ نص میں موجود ہے ۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حبیب بن ابی سلمہ سے فرمایا تھا ۔ کہ تجھے اپنے مقتول کے سامان سے وہی چیز مل سکتی ہے جو تیرا امام اپنی رضا سے تجھے دے ۔

اور جو روایة امام شافعی رحمہ اللہ نے پیش کی ہے اس میں دو احتمال ہیں ۔ ایک یہ کہ شاید شرعی اصول کا بیان ہو ، دوسرا یہ کہ تنفیل ہو ۔ تو ہم اسے دوسرے معنی پر محمول کریں گے ۔ حدیث حبیب رضوان اللہ کی بناء پر اور قاتل کا زیادہ نفع دینا جنس واحد میں مفید نہیں ، جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں (کہ کرّ اور فرّ ایک ہی جنس سے ہیں) ۔

مسئلہ : سلب سے مراد مقتول کے کپڑے ، اسلحہ ، گھوڑا اور گھوڑے کا ساز و سامان یعنی زین ، لگام وغیرہ ۔ اسی طرح گھوڑے پر جو سامان لدا ہو یعنی اس نے تھیلے میں جو کچھ ڈالا ہوا ہو یا اس کی کمر میں جو کچھ ہو اور جو اس کے علاوہ ہو وہ سلب نہ ہوگا اور جو چیز اس کے غلام کے ساتھ دوسرے جانور پر ہو تو وہ اس کا سلب نہیں ہوگا ، (بلکہ مال غنیمة ہوگا) ۔

حکم تنفیل سے جو کچھ حاصل ہوگا باقی مجاہدین کا حق اس سے منقطع ہو جائے گا ، اور مال کی ملکیة اس وقت

حاصل ہوگی ۔ جب یہ مال دارالاسلام میں آ کر محفوظ ہو جائے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ، حتی کہ اگر امام نے کہا کہ جس غازی نے کوئی لڑکی پائی وہ اسی کی ہو ۔ ایک مجاہد نے ایک لڑکی حاصل کرلی اور بذریعہ حیض اس کا حمل سے خالی ہونا معلوم کرلیا ۔ تو بھی اس کے ساتھ مباشرۃ کرنا یا اسے فروخت کرنا جائز نہ ہوگا ۔ یہ امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کی رائے ہے ۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں : اس سے مباشرۃ کرنا اور فروخت کرنا دونوں جائز ہیں ۔ کیونکہ امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک تنفیل سے ملکیۃ ثابت ہو جاتی ہے ۔ جیسے کہ دارالحرب میں امام کے تقسیم کرنے سے ثابت ہو جاتی ہے یا حربی کافر سے خریدنے میں ثابت ہوتی ہے ۔

اگر اس کا مال نفل کوئی تلف کر دے تو اس کی ضمان میں بھی یہی اختلاف ہے ۔ (یعنی شیخینؒ کے نزدیک عدم ملکیۃ کی بناء پر ضمان نہ ہوگی اور امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک ضمان ہوگی) ۔

بَابُ اِسْتِيلَاءِ الْكُفَّارِ

کافروں کے غالب ہونے کے بیان میں

مسئلہ : اگر تاتاری کافروں نے رومی نصرانیوں پر غلبہ حاصل کر لیا ۔ انہیں قیدی بنالیا اور ان کے اموال پر قبضہ کرلیا تو وہ ان سب کے مالک بن جائیں گے ۔ کیونکہ انہوں نے مال مباح پر غالب ہو کر قبضہ کرلیا ہے اور یہی ملک کا سبب ہے جیسا کہ ہم آیندہ سطور میں إن شاء الله بیان کریں گے ۔

مسئلہ : اگر ہم تاتاریوں پر غلبہ حاصل کرلیں تو جو کچھ انہوں نے رومیوں سے لیا ہے اس پر ہم قبضہ کرسکتے ہیں ۔ جیسا کہ ان کی دوسری املاک پر ہمارا قبضہ کر لینا جائز ہے ۔

مسئلہ : خدا نخواستہ اگر کفار ہمارے اموال پر غالب آ جائیں اور انہیں اپنے ملک میں لے جائیں تو وہ ان اموال کے مالک بن جائیں گے ۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ وہ مالک نہ بن سکیں گے ۔ کیونکہ جس طرح ابتداءً انہیں ہمارے ملک میں ہمارے اموال پر غلبہ ممنوع ہے ۔ اسی طرح انتہاءً یعنی اپنے ملک میں لے جانے کے بعد بھی ممنوع ہوگا اور ممنوع

اس ملکیۃ کا سبب نہیں ہوتا ۔ یہی اصول امام شافعیؒ کے نزدیک مقرر ہے ۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ غلبہ مال مباح پر واقع ہوا ہے اور اس سے ملک کے سبب کا انعقاد ہو جاتا ہے ، (یعنی مال مباح پر غلبہ ہو جانا ملک کا سبب ہوتا ہے) تا کہ مکلف کی حاجۃ کی تکمیل ہو سکے ۔ جیسا کہ ہمیں ان کے مال پر غلبہ حاصل ہوتا ہے (تو ہماری ملکیۃ بھی ثابت ہو جاتی ہے) ۔ اور ہمارا یہ کہنا کہ وہ مال مباح پر غالب ہوئے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ مال کا محترم ہونا اسی ضرورۃ کے تحت ثابت ہو جاتا ہے کہ مالک کو اس کے انتفاع کا اختیار حاصل ہو ۔ اور اللہ تعالی کا ارشاد ہے : خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (البقرۃ : ۲۹) جس نے تمہارے لیے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں ؛ اس بات کی دلیل ہے کہ زمین کی ہر چیز ہر ایک کے لیے مباح ہے ۔ تو جب ایک مالک کا اختیار جاتا رہا تو مال بدستور مباح ہوگیا ۔ لیکن ان کا صحیح غلبہ جب ہی ثابت ہوگا کہ اپنے ملک میں جا کر محفوظ کرلیں کیونکہ استیلاء یعنی غلبہ نام ہے کسی چیز پر حال اور انجام کار کے لحاظ سے تصرف کا اختیار حاصل کر لینا ۔ (ہماری دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ کفار کا غلبہ مال مباح پر ہوا ہے کیونکہ مال اپنی خلقۃ کے لحاظ سے مباح ہے بدلیل قولہ تعالی خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا اور استیلاء کا مطلب یہ ہوتا

ہے کہ کسی چیز پر ایسا غلبہ حاصل ہو جائے کہ اس سے فی الحال اور فی الاستقبال انتفاع حاصل کیا جا سکے۔ جب تک کفار ہمارے ملک میں ہیں تو وہ فی الحال انتفاع پر قادر ہیں اور جب مال اپنے ملک میں لے جائیں گے تو انجام کار بھی انتفاع پر قادر ہوں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ قرآن کریم میں مہاجرین کو فقراء کہا گیا ہے، حالیکہ مکہ میں ان کے مال موجود تھے۔ تو معلوم ہوا کہ کفار کے پاس مسلمانوں کا جو مال چلا جاتا ہے وہ ان کی ملکیة ہو جاتا ہے ورنہ مہاجرین کو فقراء نہ کہا جاتا۔ کیونکہ وہ مال فی الحال تو ان کے قبضہ میں نہ تھا۔ مگر فتح مکہ کے بعد انجام کار مسلمانوں کو اقتدار حاصل ہوگیا تھا۔ لیکن انہوں نے اپنے اموال واپس نہ لیے اور اهل مکہ کی ملکیة ہی میں رہے)۔

(اور اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ کفار کا غلبہ ممنوع ہے تو) جو شے کسی دوسرے سبب کی بناء پر ممنوع ہو اور وہ کرامة کا سبب بن سکتی ہے جو کہ حق ملکیة سے درجے میں بڑھ کر ہے۔ کرامة سے مراد ثواب آخرة ہے، تو اس دنیوی چند روزہ ملکیة کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ (یعنی جو چیز لذاتہ حرام نہ ہو بلکہ کسی دوسرے سبب کی وجہ سے حرام ہو تو وہ ملکیة کا سبب بن سکتی ہے۔ جب اس چیز سے اخروی فائدہ تو اٹھایا جا سکتا ہے تو دنیوی فائدہ کیوں نہیں اٹھایا جا سکتا۔ مثلاً کسی کے گھر

پر غاصبانہ قبضہ کر لیا اور شرعا ایسا کرنا حرام ہے۔ لیکن غاصب جو نماز اس گھر کے اندر پڑھے گا اس کا اجر و ثواب اسے آخرۃ میں ضرور ملے گا۔ تو دلیل کا مطلب یہ ہے کہ حرام لغیرہ چیز سے اخروی فوائد حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ تو اس سے کم درجے کی دنیوی چیز سے کیونکر فائدہ حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ دنیوی فائدے سے مراد کفار کا مالک ہونا ہے)۔

مسئلہ : پھر اگر مسلمان کفار کے ملک پر غالب آجائیں اور مالک اپنے اموال پالیں اور تقسیم سے پہلے ان پر قبضہ کرلیں تو وہ اموال بغیر کسی معاوضے کے ان کے ہو جائیں گے۔ اگر تقسیم کے بعد پائیں اور اپنے مال لینا چاہیں تو پھر قیمت دے کر لے سکتے ہیں۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ تجھے اپنا مال تقسیم سے پہلے مل جائے تو وہ بغیر معاوضے کے تیرا ہے۔ لیکن اگر تقسیم کے بعد ملا تو پھر قیمت دے کر لیا جا سکتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ غلبۂ کفار کی وجہ سے اس کی مرضی کے بغیر اس کی ملک زائل ہوگئی تھی، تو اس کی رعایۃ کے پیش نظر اسے واپس لینے کا حق حاصل ہے۔ البتہ تقسیم کے بعد لینے میں اس مجاہد کو نقصان پہنچتا ہے جس کے حصے میں آئی ہے۔ کیونکہ مفت لینے میں اس کی ملک خاص ضائع ہوتی ہے۔ لہذا قیمت دے کر لے سکتا ہے تاکہ دونوں طرف معاملہ اعتدال پر قائم رہے اور تقسیم سے پہلے تو تمام

مجاہدین کی اس مال میں شرکت عامہ ہوتی ہے ۔ اس لیے نقصان کا ضرر بہت کم ہوتا ہے اور وہ بغیر قیمت لے سکتا ہے ۔

مسئلہ : اگر مسلمان تاجر دارالحرب میں بغرض تجارت گیا اور وہاں سے وہی مال خرید کر دارالاسلام میں لے آیا (جو کفار غلبہ حاصل کرکے لے گئے تھے) تو اس کے سابقہ مالک کو اختیار ہے چاہے تو وہ مال قیمت خرید پر لے لے یا چاہے تو چھوڑ دے ۔ کیونکہ اگر مالک اول کو مفت دیا جائے تو اس میں تاجر کو خسارہ ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تو معاوضہ دے کر مال لایا ہے ۔ تو راہ اعتدال وہی ہے جس کا ہم نے ذکر کیا ہے (کہ چاہے تو قیمت خرید دے کر لے سکتا ہے) ۔ اگر تاجر نے وہ مال سامان کے بدلے خریدا ہو تو مالک اول سامان کی قیمت دے کر لے سکتا ہے ۔ اگر حربی وہ مال کسی مسلمان کو ہبہ کر دیں تو سابقہ مالک قیمت سے لے سکتا ہے ۔ کیونکہ ہبہ کی وجہ سے موہوب لہ کو ملک خاص حاصل ہو چکی ہے اور یہ ملک قیمت کے بغیر زائل نہیں ہو سکتی ۔

اور اگر وہ مال حربیوں سے مسلمانوں نے بطور غنیمت حاصل کر لیا ، حالیکہ وہ مال مثلی ہے ، (مال مثلی وہ ہوتا ہے جس کی اسی جیسی مثال اور نظیر پائی جائے جیسے سونا ، چاندی ، گندم اور جو وغیرہ) ، تو تقسیم سے پہلے سابقہ مالک بلا عوض حاصل کر سکتا ہے مگر بعد میں نہ لے سکے گا ۔ کیونکہ اس کی مثل دے کر لینے میں کیا فائدہ ؟ اسی طرح

اگر وہ مال مثلی کسی مسلمان کو ہبہ میں دیا گیا ہو (تو قیمت دے کر خریدنا بے سود ہے)۔ اور اسی طرح اگر مسلمان تاجر نے اس کے عوض مقدار اور وصف کے لحاظ سے اس جیسی چیز دے کر خریدا ہو (تو مالک اول نہیں لے سکے گا)۔

مسئلہ : امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں فرمایا : اگر کفار کسی غلام کو قید کرکے لے گئے اور ان کا ایک شخص اسے خرید کر دارالاسلام میں لے آئے اور کسی نے اس کی آنکھ پھوڑ دی لیکن مشتری نے اس کی دیۃ وصول کرلی تو سابقہ آقا وہی قیمت دے کر اس سے خرید سکتا ہے جو اس نے دشمنوں کو ادا کی ہے۔ قیمت سے لینے کی وجہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں (کہ مفت لینے میں خریدار کو نقصان ہوتا ہے اور مشتری کی وصول کردہ دیۃ نہ لے سکے گا۔ کیونکہ غلام پر مشتری کی ملک صحیح تھی (اور اس نے اپنی ملک میں یہ نفع حاصل کر لیا)۔ اگر سابق آقا دیۃ کی رقم لینا بھی چاہے تو اس رقم کی مثل دے کر ہی لے گا اور اس میں کوئی فائدہ نہیں۔

غلام کی قیمت میں کمی نہ کی جائے گی کیونکہ وصف کے مقابل میں دام نہیں ہوا کرتے۔ اس کی نوعیت شفعہ سے مختلف ہے، کیونکہ وہ چیز (جس پر شفعہ کیا جا رہا ہے) جب شفعہ کرنے والے کے پاس جائے گی تو خریدار کے پاس یہ چیز بمنزلہ خرید فاسد کے ہوگی، اور خرید فاسد میں

اوصاف کی ضمان واجب ہوتی ہے ؛ جیسے کہ غصب کی صورۃ میں واجب ہوا کرتی ہے ۔

زیر بحث مسئلے میں ملک صحیح ہوتی ہے لہذا دونوں صورتوں میں فرق واضح ہوگیا ۔ (یعنی متن میں مذکور صورۃ میں ملک صحیح ہے اس لیے وصف کی کمی کا اعتبار نہ ہوگا اور آقا کو قیمت خرید دینا ہوگی ۔ لیکن شفعہ اور غصب کی صورۃ میں چونکہ ملک مکمل نہیں ہوتی لہذا اگر وصف میں کمی آ جائے تو اس کی ضمان واجب ہوگی) ۔

مسئلہ : اگر کفار ایک غلام کو قید کرکے لے جائیں اور وہاں سے ایک شخص مثلاً زید ہزار درہم کے بدلے خرید کر دارالاسلام میں لے آیا ۔ لیکن کفار نے اسے دوبارہ قید کر لیا اور دارالحرب میں لے گئے اور ایک دوسرا شخص مثلاً عمرو اسے پھر ہزار درہم سے خرید کر دارالاسلام میں لے آیا تو اب پہلے آقا کو یہ اختیار نہیں کہ وہ عمرو سے قیمت کے عوض لے سکے ، کیونکہ دوسری مرتبہ قید کا واقعہ اس ملک میں ظہور پذیر نہیں ہوا ۔ البتہ زید کو اختیار ہے کہ وہ عمرو کو قیمت دے کر خرید لے ، کیونکہ قید کا واقعہ زید کی ملک میں ظہور پذیر ہوا ، اگر قدیم مالک چاہے تو دو ہزار درہم دے کر لے سکتا ہے ۔ کیونکہ غلام پر دو قیمتیں صرف ہو چکی ہیں اور مالک اول دو ثمن ادا کرنے کے بعد مستحق ہوگا ۔

اگر مشتری اول یعنی زید کہیں غائب ہوگیا تو مالکہ

قدیم کو عمرو سے لینے کا حق نہیں ۔ جیسا کہ زید کی موجودگی کی صورۃ میں اسے حق نہ تھا ۔

مسئلہ : اور اہل حرب ہم پر غلبہ حاصل کر کے ہمارے مدبر ، ام ولد اور مکاتب غلاموں نیز ہمارے آزاد لوگوں کے مالک نہیں بن سکتے ۔ مگر ہم ان پر غالب آ کر ان تمام انواع کے مالک بن سکتے ہیں ۔ کیونکہ سبب اپنے محل میں ملکیۃ کا فائدہ دیتا ہے اور محل سے مراد مال مباح ہے اور آزاد آدمی بذات خود معصوم و محترم ہے اور دوسرے لوگ (یعنی مدبر ، ام ولد اور مکاتب) بھی بذات خود محترم ہیں ۔ کیونکہ ان میں من وجہ یعنی کسی نہ کسی حد تک حریۃ ثابت ہو چکی ہے ۔ بخلاف کفار کی گردنوں کے کیونکہ ان کی عصمت و احترام کو شریعۃ نے ان کے جرم کفر کی وجہ سے ساقط کر دیا ہے ۔ (اور ان کو غلامی کا مستحق قرار دیا ہے ۔ مگر متن میں مذکور ان لوگوں کا کوئی ایسا جرم نہیں) ۔

مسئلہ : اگر کسی مسلمان شخص کا مسلمان غلام بھاگ کر دارالحرب میں چلا جائے اور وہ اسے پکڑلیں تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک وہ مالک نہ بن سکیں گے ۔ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کہتے ہیں کہ وہ مالک بن جائیں گے ۔ کیونکہ غلام کی عصمت مالک کے حق کی وجہ سے ہوتی ہے ۔ کہ مالک کا قبضہ اس پر قائم تھا اور اب یہ قبضہ زائل ہوچکا ہے ۔ (تو اب غلام کی عصمت بھی باقی نہ رہی اور وہ مالک

بن سکیں گے) لہذا اگر اسے دارالاسلام سے پکڑ کر لے جائیں تو اس کے مالک بن جاتے ہیں ۔

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں : دارالاسلام سے نکل جانے کی وجہ سے اسے اپنے نفس پر اپنا اختیار حاصل ہوگیا ۔ پہلے اس کا ذاتی اختیار اس کے لیے معدوم تھا کہ اس پر مولی کا اختیار متحقق تھا ۔ تاکہ آقا کو اس سے انتفاع ممکن ہو اور جب دارالحرب میں چلے جانے سے آقا کا اختیار جاتا رہا ، تو اسے خود اپنے نفس پر اختیار حاصل ہوگیا تو وہ معصوم و محترم بن گیا اور ملک کا محل نہ رہا ۔ بخلاف اس بھاگے ہوئے غلام کے جو دارالاسلام ہی میں چھپتا چھپاتا پھر رہا ہو ۔ (اس کو اپنے نفس پر اختیار نہ ہوگا) کیونکہ مولی کی ملکیۃ باقی ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس پر اہل دارالاسلام کا قبضہ موجود ہے ۔ جو اس کے اپنے اختیار کے ظہور سے مانع ہے ۔

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جب دارالحرب والوں کی ملک ثابت نہیں ہوتی ، تو اس کا قدیم مالک کسی معاوضے کے بغیر لینے کا مستحق ہوگا ۔ خواہ وہ کسی کو ہبہ کر دیں یا کوئی مسلمان ان سے خرید کر لائے یا مال غنیمت میں آ جائے اور غنیمت کی تقسیم نہ ہوئی ہو ۔

اور تقسیم کے بعد بھی سابق مالک لینے کا مستحق ہوگا مگر اس کا معاوضہ بیت المال سے ادا کیا جائے گا ۔ تقسیم کے عمل کا اعادہ ممکن نہیں کیونکہ مجاہدین اپنا اپنا حصہ لے کر متفرق ہو چکے ہیں اور پھر ان کا اکھٹا کرنا ممکن نہیں ۔

اور جو (یعنی مجاہد ، تاجر یا موہوب لہ) اس غلام کو دارالحرب سے لایا ہے ، اس کا غلام کو لانے کا استحقاق مالک پر نہیں ہے . کیونکہ یہ کام اس نے اپنی ذات کے لیے کیا تھا . اس کا خیال تھا کہ یہ میری ملک میں آ چکا ہے .

مسئلہ : اگر ہمارا اونٹ دارالحرب کی طرف بھاگ جائے اور کفار اسے پکڑ لیں تو اس کے مالک بن جائیں گے . کیونکہ ان کا استیلاء متحقق ہو چکا ہے اور حیوانات کا کوئی ایسا ذاتی اختیار نہیں ہوتا جو دارالاسلام سے نکلنے پر ظاہر ہو . بخلاف بھاگنے والے غلام کے جیسا کہ ہم ذکر کرچکے ہیں .

اگر اس اونٹ کو کوئی شخص خرید کر دارالاسلام میں لے آئے تو اس کا اصل مالک اگر پسند کرے تو قیمت دے کر لے سکتا ہے . جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں (کہ مفت لینے میں مشتری کو خسارہ ہے) .

اگر حربیوں کے پاس ہمارا غلام گھوڑا اور سامان لے کر بھاگ جائے اور مشرک ان سب پر قبضہ کرلیں اور کوئی شخص مشرکین سے یہ سب کچھ خرید کر دارالاسلام میں لے آئے تو آقا غلام کو بغیر معاوضے کے لے لے گا اور گھوڑا اور سامان قیمت سے لے گا . یہ امام ابو حنیفہؒ کی رائے ہے . صاحبینؒ کا ارشاد ہے کہ غلام اور جو کچھ اس کے ساتھ ہے قیمت دے کرلیا جائے گا . حالت اجتماع کو حالت انفراد پر قیاس کریں گے (یعنی جب اکیلا غلام بھاگ کر جاتا تو اس کا

جو حکم تھا وہی حکم گھوڑے اور سامان کے ساتھ بھاگنے کی صورت میں بھی ہوگا) ۔ اور ہر فرد کا حکم ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ۔

مسئلہ : جب حربی شخص امان لے کر دارالاسلام میں داخل ہوا اور یہاں سے مسلم غلام خرید کیا اور اسے دارالحرب میں لے گیا ۔ تو وہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک آزاد ہو جائے گا ۔ صاحبینؒ نے کہا کہ آزاد نہ ہوگا کیونکہ حربی کافر کی ملکیة کا ازالہ ایک مخصوص طریق بیع سے واجب تھا (یعنی حربی کو مجبور کیا جاتا کہ وہ غلام کو فروخت کر دے اور اس کے انکار کی صورت میں قاضی اسے قیمت دے کر مسلمان غلام کو فروخت کر دیتا) ۔ اب حربی پر جبر کرنے کی صورت ہی نہ رہی ، لہذا اس کے قبضہ میں مملوک ہو کر رہے گا ۔

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں : مسلمان کو کافر کی ذلت سے رہائی دلانا واجب ہے ۔ (اللہ تعالی کا ارشاد ہے : لَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلاً (النساء : ۱۴۱) اللہ تعالی نے کافروں کے لیے مسلمانوں پر غالب آنے کی ہرگز کوئی سبیل نہیں رکھی ہے ۔ تو شرط یعنی دونوں ملکوں کے الگ الگ ہونے کو علة کے قائم مقام ٹھیرایا جائے گا ۔ علة سے مراد آزاد کرنا ہے تاکہ غلام کافر کی ذلة سے مخلصی حاصل کر سکے ۔ جیسا کہ تین حیض گزر جانے کو طلاق کے قائم مقام قرار دیا جاتا ہے ۔ جب کہ میاں بیوی میں سے ایک

دارالحرب میں اسلام لے آئے. (یعنی جب زوجین میں ایک شخص دارالاسلام میں مشرف باسلام ہو جاتا ہے ، تو تین حیض گزر جانے کے بعد ان میں تفریق واقع ہو جاتی ہے . تو اس صورت میں شرط یعنی تین حیض گزر جانے کو علۃ یعنی تفریق کے قائم مقام ٹھہرایا گیا) .

مسئلہ : اگر حربی کا غلام مشرف بہ اسلام ہو کر دارالاسلام میں آ جائے یا مسلمان دارالحرب پر غلبہ کر لیں اور غلام وہیں ہو تو وہ آزاد ہوگا . اسی طرح اگر حربیوں کے غلام لشکر اسلام میں آ جائیں تو وہ آزاد ہوں گے . جیسا کہ مروی ہے کہ طائف کے غلاموں میں سے کچھ غلام مسلمان ہو کر نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوگئے تو آپ نے ان کی آزادی کا فیصلہ صادر فرمایا اور فرمایا کہ یہ لوگ اللہ تعالی کے لیے آزاد کیے ہوئے ہیں .

دوسری بات یہ ہے کہ مسلمان غلام نے اپنے آقا کے علی الرغم دارالاسلام میں آ کر یا مسلمانوں کے غلبہ حاصل کرنے کی صورۃ میں لشکر میں لاحق ہو کر اپنے آپ کو محفوظ کرلیا ہے . اور اس کا اپنی ذات پر قبضہ و اختیار ثابت کرنا اس امر سے اولی ہے کہ اس پر مسلمانوں کا قبضہ ثابت کیا جائے . کیونکہ اپنی ذات پر اختیار اسے پہلے ہی حاصل ہو چکا ہے . تو اس اختیار کی مزید پختگی اور استواری کی ضرورت تھی اور مسلمانوں کے قبضہ میں ابتداء ثبوت کی

ضرورت ہے تو غلام کا اپنا ذاتی قبضہ اور اختیار اولی ہے ۔
(یعنی مسلمانوں کا قبضہ تو جب ثابت ہوتا کہ وہ ابتداءً ہی قبضہ کرتے ۔ مگر ابتداءً تو وہ خود بوجہ اسلام اپنا قبضہ حاصل کر چکا ہے) ۔

بَابُ الْمُسْتَأْمِنِ

امان حاصل کرنے والے کا بیان

مسئلہ : جب ایک مسلمان شخص تاجر کے طور پر دارالحرب میں امان لے کر داخل ہو تو اس کے لیے کسی طرح جائز نہیں کہ ان کے اموال یا جانوں سے کسی قسم کا تعرض کرے ۔ کیونکہ امان حاصل کرکے اس نے یہ ذمہ داری قبول کی ہے کہ وہ ان سے تعرض نہ کرے گا اور اس کے بعد تعرض کرنا غدر ہے ، اور غدر حرام ہے ۔ البتہ جب کافروں کا سردار ان تاجروں کے ساتھ غدر کا ارتکاب کرے بایں طور کہ ان کے مال چھین لے یا انہیں قید میں ڈال دے یا دوسرا آدمی سردار کے علم کے باوجود ایسا کرے اور سردار انہیں منع نہ کرے (تو مسلمان تاجر پر عہد کی ذمہ داری نہ رہی) ، کیونکہ کفار نے خود عہد کو توڑا ہے ۔ بخلاف اس شخص کے جسے کفار قید کرکے لے جائیں ۔ (تو وہ جو چاہے سو کرے) کیونکہ اس نے امان کا عہد نہیں کیا اس لیے تعرض مباح ہوگا خواہ اسے اپنی مرضی سے رہا کر دیں ۔

اگر مسلمان تاجر نے دارالحرب میں غدر کا ارتکاب کیا

مثلاً ان کی کوئی چیز لے کر دارالاسلام میں آ گیا تو اس چیز کا مالک ہو جائے گا۔ مگر یہ ملک حرام طریق پر ہوگی کیونکہ غلبہ تو مال مباح پر ہوا ہے۔ لیکن اس کی ملکیة غدر کے سبب حاصل ہوئی ہے۔ تو اس غدر کی وجہ سے مال میں خباثة آ گئی۔ اسے یہ مال صدقہ کر دینے کا حکم دیا جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حرمة لغیره انعقاد سبب سے مانع نہیں ہوتی جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔

مسئلہ: جب مسلمان امان لے کر دارالحرب میں داخل ہوا اور وہاں اسے کسی حربی نے ادھار دیا، یا اس نے کسی حربی کو ادھار دیا، یا مسلم اور حربی میں سے کسی نے دوسرے کی کوئی شے غصب کرلی، پھر مسلمان دارالاسلام میں واپس آ گیا اور پھر حربی امان لے کر دارالاسلام میں آیا تو دونوں میں کسی کے لیے بھی دوسرے کے خلاف کوئی حکم نہ دیا جائے گا۔ ادھار کے سلسلے میں اس لیے کہ قضاء قاضی کا دار و مدار ولایة پر ہوتا ہے اور دارالحرب میں ادھار لینے دینے کے وقت قاضی کی ولایة معدوم تھی اور حکم قضاء دینے کے وقت بھی قاضی کو اس مستأمن پر ولایت حاصل نہیں ہے۔ کیونکہ حربی نے اپنے گذشتہ افعال کے بارے میں حکم اسلام کا التزام نہیں کیا۔ بلکہ اس نے مستقبل کے افعال کے بارے میں التزام کیا ہے (یعنی جب تک وہ ہمارے ہاں مقیم ہے اس پر احکام اسلامی عاید ہوں گے)۔

غصب کے سلسلے میں اس لیے کہ جو چیز اس نے جبراً لی تھی وہ اس کا مالک بن چکا ہے. جب کہ غصب کر کے اس نے اس پر غلبہ حاصل کر لیا تھا . کیونکہ غصب ایسے مال پر واقع ہوا جو محترم و معصوم نہیں ہے ، جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں (کہ دارالحرب کے اموال ، لوگ اور ملک قابل ملکیة اور غیر محترم ہیں) .

اسی طرح اگر دونوں حربی ہوں اور انھوں نے ادھار یا غصب کا کام کیا ہو اور پھر امان لے کر ہمارے ملک میں آ جائیں ، تو ہمارے ہاں ان کا فیصلہ نہ کیا جائے گا . جیسا کہ مذکورہ بالا سطور میں بیان کیا گیا ہے .

مسئلہ : مذکورہ صورت میں اگر حربی مسلمان ہو جائے اور وہ اور امان لے کر جانے والا مسلمان دونوں دارالاسلام میں آ جائیں ، تو ادھار کے بارے میں ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جائے گا ، لیکن غصب کے بارے میں فیصلہ نہیں کیا جائے گا .

قرض کے بارے میں اس لیے کہ قرض کا لین دین دونوں کی رضا مندی سے صحیح طور پر واقع ہوا اور قاضی کی ولایة بھی فیصلے کی حالة میں ثابت ہے . کیونکہ دونوں نے اسلامی احکام کا التزام کر لیا ہے .

اور غصب کے بارے میں فیصلہ نہیں کیا جائے گا . جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ چھینی ہوئی چیز اس کی ملکیة میں آ چکی ہے اور حربی کی ملکیة میں کوئی خرابی نہیں

کہ اسے واپس کرنے کا حکم دیا جائے۔

مسئلہ : جب مسلمان امان لے کر دارالحرب میں داخل ہو اور حربی کا مال غصب کرے (حربی اسلام قبول کرلے) اور دونوں دارالاسلام میں آئیں ، تو دیانت اور اخلاق کے مد نظر مغصوبہ شے کی واپسی کا حکم دیا جائے گا ۔ لیکن عدالت اس کے خلاف فیصلہ صادر نہیں کر سکتی ۔ عدم قضاء کی وجہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ غاصب مالک بن جاتا ہے ۔ اور امر بالرد کا یہ مطلب ہے کہ مسلمان کو فتوی دیا جائے گا (کہ وہ مال واپس کر دے) کیونکہ وہ شے اس کی ملک میں فاسد طور پر آئی ہے ۔ اس واسطے کہ اس نے ایک حرام امر یعنی نقض عہد کا ارتکاب کیا ہے ۔

جب دو مسلمان امان لے کر دارالحرب میں داخل ہوں تو ان میں سے ایک اپنے ساتھی کو ارادةً یا خطاءً قتل کرے تو قاتل پر اس کے مال سے دیة واجب ہوگی اور خطاء کی صورة میں کفارہ ہوگا ۔

کفارہ تو اس لیے کہ حکم کتاب مطلق ہے (وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِناً خَطَاءً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ اِلٰى اَهْلِهٖ (النساء : ۹۲) اور جو شخص کسی مؤمن کو غلطی سے قتل کرے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ ایک مؤمن کو غلامی سے آزاد کرے اور مقتول کے وارثوں کو خون بہا دے ۔ ملاحظہ کیجیے کہ اس آیة میں دارالاسلام میں قتل کرنے کی کوئی قید نہیں ہے) ۔

دیۃ اس لیے واجب ہے کہ مسلمان کو جو جانی عصمت دارالاسلام میں حاصل تھی ، وہ دارالحرب میں امان لے کر جانے کے عارضے سے ساقط نہیں ہوتی (لہذا اس کا خون رائیگاں نہیں جائے گا اور قاتل پر دیۃ لازم ہوگی . البتہ قصاص ساقط ہوگا) ، قصاص اس لیے لازم نہیں کہ قصاص قوۃ و منفعۃ کے بغیر ممکن نہیں ہوتا اور یہ قوۃ امام اور مسلمانوں کی جماعت کے بغیر حاصل نہیں ہوتی . لیکن یہ بات دارالحرب میں نہیں پائی جاتی . (لہذا قصاص واجب نہ ہوگا) .

عمد کی صورۃ میں دیۃ صرف قاتل کے مال سے واجب ہوتی ہے ، کیونکہ اس کی برادری عمداً قتل کا بوجھ اپنے ذمے نہ لے گی .

اور خطاء کی صورۃ میں (بھی) برادری کے مال سے دیۃ نہ ہوگی بلکہ اس کے اپنے مال سے ہوگی) . برادری کو یہ قدرۃ حاصل نہیں کہ وہ قاتل کو ایسے فعل سے روک سکیں ، کیونکہ دونوں ملک الگ الگ ہیں اور برادری پر دیۃ تب واجب ہوتی جب وہ قاتل کو روکنے سے جان بوجھ کر کنارہ کشی کرتی . (یعنی خطاء کی صورۃ میں برادری پر دیۃ نہ ہوگی ، کیونکہ ان پر یہ جرمانہ تب ہوتا کہ وہ قاتل کو ایسا فعل کرنے سے نہ روکتے . اب موجودہ صورۃ میں جب قاتل دارالحرب میں جرم کر رہا ہے تو وہاں اس کی برادری کا کیا اختیار ہے . لہذا برادری کی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہوئی کہ ان پر دیۃ واجب کی جائے) .

مسئله : اگر دارالحرب جانے والے دونوں مسلمان کفار کے ہاتھ میں قیدی ہوں اور ایک قیدی دوسرے ساتھی کو قتل کر دے یا مسلمان تاجر قیدی کو قتل کر دے تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک قاتل پر کوئی شے نہ ہوگی . البتہ قتل خطاء کی صورۃ میں کفارہ واجب ہوگا .

صاحبین نے کہا کہ دونوں قیدیوں کی صورۃ میں دیۃ واجب ہوگی . قتل عمداً ہو یا خطاءً کیونکہ عصمت عارضۂ قید کی وجہ سے باطل نہیں ہوتی . جیسا کہ امان لے کر جانے کی صورۃ میں باطل نہیں ہوتی جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں . اور قصاص کا ساقط ہونا عدم منفعۃ و قوۃ کی کی بناء پر ہے ، اور دیۃ اس کے اپنے مال سے ہوگی . اس کی تفصیل کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں .

امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں : قید کی وجہ سے قیدی ان کے تابع ہوگا ، کیونکہ وہ ان کے ہاتھوں میں مجبور و مغلوب ہے . اسی وجہ سے ان کے مقیم ہونے سے یہ بھی مقیم ہوگا اور ان کے سفر کرنے پر یہ بھی مسافر ہوگا . تو اس سے اپنے نفس کی حفاظت و صیانت جاتی رہی اور اس کی حیثیت اس مسلمان کی سی ہوگی جس نے ہماری طرف ہجرت ہی نہیں کی .

متن میں کفارے کے ساتھ خطاء کی تخصیص کی گئی ہے کیونکہ ہمارے نزدیک عمد کی صورۃ میں کفارہ نہیں ہوتا .

فصل

حربی کے امان لے کر آنے کا بیان

مسئلہ : اور جب حربی ہمارے ملک میں امان لے کر داخل ہو تو اسے یہ اختیار نہیں دیا جائے گا کہ وہ سال بھر اقامۃ کرے ۔ اور امام اسے آگاہ کر دے کہ اگر تو سال بھر رہا تو میں تجھ پر جزیہ لگا دوں گا ۔ اس بارے میں اصل قانون یہ ہے کہ حربی کو ہمارے ملک میں دائمی اقامت کا اختیار نہیں ہوتا ، مگر یہ کہ اسے غلام بنا لیا جائے یا اس پر جزیہ عاید کر دیا جائے ۔ ورنہ اس قدر طویل قیام سے وہ جاسوسی کے فرائض سر انجام دینے لگے گا اور ہمارے خلاف مددگار ثابت ہوگا ، جس سے مسلمانوں کو ضرر لاحق ہونے کا خدشہ ہے ۔ البتہ اسے تھوڑا عرصہ رہنے کا اختیار دیا جائے گا ۔ کیونکہ اگر اتنی مدۃ کے لیے بھی منع کر دیں تو اناج اور دیگر اشیاء کی رسد منقطع ہونے کا اندیشہ ہے اور تجارۃ کی راہیں مسدود ہو جائیں گی ۔ سو ہم نے مدۃ قلیل اور کثیر میں تمییز کرنے کے لیے ایک سال کا وقت مقرر کیا ۔ کیونکہ اتنی مدۃ میں جزیہ واجب ہو جاتا ہے ۔ تو اس قدر اقامۃ کی اجازۃ جزیہ کی مصلحۃ کے تحت ہوگی ۔

اگر سال کے اختتام سے پہلے پہلے امام کے آگاہ کرنے پر اپنے وطن کو مراجعت کرگیا تو اس سے جزیہ لینے کی کوئی سبیل نہیں . اور اگر سال بھر اقامة کرے تو وہ ذمی بن جائے گا (اور وطن واپس نہ جا سکےگا) ، کیونکہ امام کے متنبہ کرنے کے باوجود وہ سال بھر ٹھیرا رہا تو گویا اس نے جزیہ کا التزام کرلیا اور ذمی بن جائے گا . امام کو اختیار ہے کہ سال سے کم مدة کے لیے ایک ماہ یا دو ماہ مقرر کر دے .

مسئله : اگر امام کے متنبہ کرنے کے بعد وہ سال بھر رکا رہا تو ذمی بن جائے گا جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں . پھر اسے دارالحرب کی طرف نہیں جانے دیا جائے گا . کیونکہ عقد ذمہ توڑا نہیں جاتا اور اسے کیوں جانے دیا جائے . کیونکہ اس کے چلے جانے سے ایک تو جزیہ میں کمی آئے گی اور دوسرا اس کی اولاد ہمارے خلاف جنگ میں حصہ لینے والی ہوگی اور اس سے مسلمانوں کو ضرر پہنچنے کا احتمال ہے .

مسئله : اگر حربی دارالاسلام میں امان لے کر آیا اور یہاں آ کر خراجی زمین خرید لی . جب اس کا خراج مقرر کر دیا گیا تو وہ ذمی ہوگا . کیونکہ خراج زمین بمنزلہ خراج رأس یعنی جزیہ کے ہوگا . پس جب اس نے خراج کا التزام کر لیا تو دارالاسلام میں قیام کا التزام کر لیا . البتہ یہ یاد رہے کہ وہ صرف زمین کی خرید سے ذمی نہ بنے گا . کیونکہ بعض اوقات زمین تجارت کے لیے بھی خریدی جاتی

ہے۔ لیکن جب ذمی پر زمین کا خراج لازم ہوگیا تو اس کے بعد آیندہ سال کے لیے اس پر جزیہ لازم آئے گا کیونکہ لزوم خراج سے وہ ذمی بن جاتا ہے، تو مدۃ کا اعتبار خراج کے واجب ہونے کے وقت سے ہوگا۔

اور جامع صغیر میں امام محمدؒ کا قول: فَاذَا وُضِعَ عَلَيْهِ الْخَرَاجُ فَهُوَ ذِمِّیٌّ (یعنی جب اس پر خراج مقرر کر دیا گیا تو وہ ذمی ہے) لزوم جزیہ کی صراحۃً شرط ہے۔ (یعنی خراج لازم کرنے سے پہلے وہ ذمی نہیں بنتا) اور اسی پر بہت سے احکام کی تخریج ہوتی ہے لہذا اس سے غفلت نہ برتی جائے۔ (مثلاً پھر وہ دارالحرب کی طرف نہیں جا سکتا، مسلمان اور اس کے درمیان قصاص جاری ہوگا۔ مسلمان اس کی شراب کی قیمت کا ضامن ہوگا اسے کسی قسم کی تکلیف نہ دی جائے گی وغیرہ وغیرہ)۔

مسئلہ: اگر حربی عورت امان لے کر دارالاسلام میں آئے اور ذمی سے شادی کر لے تو ذمیہ بن جائے گی، کیونکہ اس نے زوج کے تابع ہو کر یہاں اقامت کا التزام کر لیا ہے۔

جب حربی امان لے کر آئے اور ذمیہ سے شادی کرے تو ذمی نہ بنے گا، کیونکہ اس کے لیے ممکن ہے کہ وہ ذمیہ کو طلاق دے کر وطن کو مراجعت کرے پس وہ اقامت کا التزام کرنے والا نہ ہوگا۔

مسئلہ: اگر کوئی حربی امان لے کر دارالاسلام میں آئے اور پھر دارالحرب کو لوٹ جائے اور دارالاسلام میں

کوئی امانت کسی مسلمان یا ذمی کے پاس چھوڑ جائے یا ان کے ذمے اس کا قرض ہو (اور بغیر امان لیے پھر دارالاسلام میں آ جائے) تو واپس آنے سے اس کا خون مباح ہوگا ۔ کیونکہ اس نے پہلی امان تو باطل کر دی ہے اور دارالاسلام میں اس کا جو مال ہے وہ معرض خطر میں ہے ۔ پس اگر وہ گرفتار کر لیا گیا یا دارالحرب پر مسلمانوں کے غلبہ کے وقت وہ قتل ہوگیا تو اس کے دیے ہوئے قرضے ساقط ہوگئے اور ودیعة یعنی امانت غنیمة شمار ہوگی ۔ کیونکہ ودیعة تو معنوی لحاظ سے گویا اسی کے ہاتھ میں ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دارالاسلام میں وہ جس کے پاس ودیعة رکھ گیا ہے اس کا قبضہ حربی کے قبضے کے قائم مقام ہے ۔ گویا کہ وہ حربی خود غنیمة میں آگیا تو اس کے تابع ہو کر امانت بھی غنیمة ہو جائے گی (جسے عامة المسلمین کے مفاد کے لیے بیت المال میں رکھ دیا جائے گا) ۔

قرض کی صورة میں اس کا قبضہ تب ثابت ہوتا ہے جب وہ مطالبہ کرتا ۔ لیکن اب مطالبے کی کوئی صورة نہیں تو مقروض کا قبضہ بہ نسبت دوسرے مسلمانوں کے قبضے سے پہلے کا ہے لہذا یہ اسی کے ساتھ خاص ہوگا ۔

اگر حربی قتل ہو جائے لیکن مسلمان دارالحرب پر غالب نہ آئے ہوں ۔ تو قرض اور امانت وصول کرنے کے حق دار اس کے وارث ہوں گے ۔ اسی طرح حربی اگر مر جائے (تو قرض اور امانت کے مالک اس کے وارث ہوں گے) کیونکہ

اس کی ذات غنیمۃ میں داخل نہیں ہوئی ، اسی طرح اس کا مال بھی غنیمۃ شمار نہ ہوگا ۔ کیونکہ دارالاسلام میں آنے کے وقت جو امان لی گئی تھی وہ اس کے مال کے حق میں باقی ہے ، تو قرضہ یا ودیعۃ کا وہ حق دار ہوگا اور اس کی موت کے بعد وارث مستحق ہوں گے ۔

مسئلہ : امام قدوری نے فرمایا : مجاہدین نے اہل حرب کے جو اموال تاخت کرکے لیکن لڑے بغیر لیے وہ خراج کی طرح مسلمانوں کے مصالح کے لیے خرچ کیے جائیں گے ۔ ہمارے مشایخ نے فرمایا کہ یہ اموال ان زمینوں کے مثل ہیں جن سے کفار کو جلا وطن کر دیا گیا ہو اور مثل جزیہ کے ہیں اور ان اراضی میں خمس نہ ہوگا ۔

امام شافعی فرماتے ہیں : غنیمۃ کی طرح ان میں بھی خمس ہوگا (یعنی اراضی اور جزیہ میں) ہماری دلیل یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ ، حضرت عمرؓ اور حضرت معاذؓ نے جزیہ وصول کرکے بیت المال میں داخل کر دیا اور اس سے خمس نہ لیا گیا ۔ دوسری بات یہ ہے کہ مسلمانوں نے وہ اپنی قوۃ سے حاصل کیا ہے مگر انھوں نے جنگ نہیں کی ۔ بخلاف غنیمۃ کے کہ وہ تو مجاہدین کی جنگ اور مسلمانوں کی قوۃ سے حاصل ہوتا ہے ۔ پس وہ مال معنوی لحاظ سے (یعنی بوجہ رعب و قوۃ) خمس کا مستحق ہوتا ہے اور باقی چار حصوں کے حق دار مجاہدین ہوں گے ، کیونکہ انھوں نے جنگ میں شرکۃ کی ہے ۔ اور جو مال بغیر جنگ کے حاصل ہوتا ہے اس میں

صرف ایک سبب پایا جاتا ہے (یعنی قوۃ و رعب) لہذا اس مال میں ایجاب کی کوئی وجہ نہیں .

مسئلہ : جب حربی امان لے کر دارالحرب میں داخل ہو اور دارالحرب میں اس کی بیوی، چھوٹی اولاد اور بڑی اولاد اور مال و متاع ہے. اس مال کا کچھ حصہ ذمی کے پاس ، کچھ حربی کے پاس اور کچھ مسلمان کے پاس بطور ودیعۃ پڑا ہے. حربی دارالاسلام میں اسلام لے آیا . پھر مسلمانوں نے دارالحرب پر غلبہ حاصل کر لیا تو یہ سب کچھ مال غنیمۃ میں شمار ہوگا .

عورت اور بڑی اولاد کا معاملہ تو واضح ہے . کیونکہ وہ حربی ہیں اور بڑی عمر کے ہیں اور اسلام لانے میں حربی کے تابع نہ ہوں گے . اگر عورت حاملہ ہو تو اس بچے کے متعلق بھی یہی حکم ہوگا جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں . (کہ وہ ماں کا جزء ہے اور ماں کی غلامی کی بناء پر غلام ہوگا) .

چھوٹی اولاد اس لیے مال غنیمۃ میں شمار ہوگی کہ چھوٹی اولاد باپ کے اسلام لانے کی صورۃ میں اس کے تابع شمار ہوتی ہے کہ جب وہ باپ کے قبضے اور اس کی نگرانی میں ہوں اور اس کی ولایت میں ہوں . مگر دارالاسلام اور دارالحرب کے الگ الگ ہونے کی وجہ سے یہ صورۃ ممکن نہ رہی . اسی طرح اس کا مال بھی . کیونکہ بوجہ اسلام حربی کی جان تو محفوظ ہوگئی ، مگر مال اس قسم کی حفاظت سے محروم ہے . اس کی وجہ اختلاف دارین ہے تو

یہ سب کچھ غنیمۃ شمار ہوگا۔

مسئلہ: اگر حربی دارالحرب میں اسلام لے آئے اور پھر دارالاسلام میں آئے اور اس کے بعد دارالحرب پر غلبہ حاصل کر لیا جائے تو اس کی چھوٹی اولاد آزاد اور مسلمان ہوگی۔ کیونکہ اب انھیں اسلام میں اپنے باپ کے تابع شمار کیا جائے گا۔ کیونکہ جب اس نے اسلام قبول کیا تھا تو وہ اس کی ولایۃ میں تھے اور ملک بھی واحد تھا (یعنی دارالحرب میں تھے) اور اس نے جو مال ذمی یا مسلمان کے پاس امانت رکھا تھا اسی کا ہو۔ کیونکہ وہ قبضۂ محترم میں ہے اور جس شخص کے پاس امانت رکھی گئی ہے اس کا قبضہ اصل مالک کے قبضے کی طرح ہے اور اس کے علاوہ سب کچھ غنیمۃ ہوگا۔ عورت اور بڑی اولاد کے غنیمۃ ہونے کی وجہ ابھی ہم نے بیان کی ہے اور جو مال حربی کے پاس امانۃ ہے وہ مال محترم کی حیثیت حاصل نہ کر سکا کیونکہ حربی کا قبضہ محترم قبضہ نہیں ہے۔

مسئلہ: جب حربی دارالحرب میں اسلام لے آئے پھر اسے کوئی مسلمان عمداً یا خطأً قتل کر دے اور اس مسلم حربی کے دارالحرب میں مسلمان وارث بھی ہوں تو قاتل پر کوئی شے نہ ہوگی البتہ قتل خطاء کی صورۃ میں کفارہ واجب ہوگا۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں: قتل خطاء کی صورۃ میں دیۃ واجب ہوگی اور قتل عمد کی صورۃ میں قصاص لازم ہوگا۔

کیونکہ قاتل نے معصوم خون بہایا ہے ، حالیکہ اسلام اس کے نفس کے محافظ کے طور پر موجود ہے . کیونکہ اسلام انسان کے لیے حفاظة و کرامة کا سبب ہوتا ہے . اس کی وجہ یہ ہے کہ (اسلام سے حاصل شدہ) عصمت و حفاظت گناہ کا ذریعہ بنتی ہے . (اگر اسے توڑا جائے) اور اس سے زجر اصلی کا ثبوت ہوتا ہے (یعنی جس نفس کے بارے میں علم ہو کہ یہ شرعی طور پر معصوم ہے اور اس کے قتل سے مجھے گناہ عظیم ہوگا ، تو انسان حصول گناہ کے پیش نظر جرم کے ارتکاب سے پرہیز کرتا ہے) اور زیر بحث صورة میں یہ عصمت بالاجماع ثابت ہے . (یعنی آپ اور ہم سب اس بات کے قائل ہیں کہ مسلمان کو جہاں بھی بلا وجہ قتل کیا جائے گناہ کبیرہ ہے) . اور دیت کا واجب کرنا اس عصمة و حفاظة کی تکمیل کا سبب ہوتا ہے ، تاکہ وہ اس جرم سے کامل طور پر احتراز کرے . (یعنی اس جرم سے روکنے والی اصل چیز تو اسلام کی عطا کردہ عصمة ہے . جس کے خوف سے وہ جرم کے اقدام پر جرأت نہ کرے گا . لیکن جب اسے وجوب دیة کا بھی علم ہوگا تو وہ جرم سے من کل الوجوہ باز رہنے کی کوشش کرے گا) ، تو دیة کا لازم آنا بطور وصف کے ہے (یعنی عصمة اسلامی اصل کی حیثیت رکھتی ہے اور دیة وصف کی) . تو جس طرح اصل یعنی عصمت کا تعلق اسلام سے ہے اسی طرح وصف یعنی دیة کا تعلق بھی اسلام سے ہوگا . (پس ثابت ہوگیا کہ قتل خطاء کی صورة میں دیة ہوگی اور

قتل عمد کی صورۃ میں قصاص ۔

ہماری دلیل اللہ تعالی کا یہ ارشاد ہے : فَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ (النساء:۹۲) لیکن اگر وہ مسلمان مقتول کسی ایسی قوم سے تھا جس سے تمھاری دشمنی ہو تو اس کا کفارہ ایک مؤمن غلام آزاد کرنا ہے ۔ آیۃ میں فاء جزاء کے مد نظر یہ واضح ہے کہ اللہ تعالی نے آزادی غلام ہی کو پوزی جزاء واجب قرار دیا ہے ۔ دوسری بات یہ ہے کہ جو جزاء واجب ہے آیۃ میں وہی مذکور ہے ۔ تو اس کے سوا اور کوئی اضافہ نہ کیا جائے گا ۔

تیسری بات یہ ہے کہ جس عصمۃ کے توڑنے سے انسان گناہگار ہوتا ہے ، وہ عصمۃ بوجہ آدمیۃ ہوتی ہے (نہ کہ اسلام کی بناء پر ، اس لئے انسان اپنی خلقۃ و اصل کے لحاظ سے اشرف المخلوقات ہے) ۔ کیونکہ انسان اس لیے عالم وجود میں لایا گیا ہے کہ وہ احکام شرعیہ کا متحمل ہو اور ان احکام پر قیام اس وقت ممکن ہے جب کہ نفس انسانی سے تعرض حرام جانے ، (تو آدمی مطلقاً اور خلقۃ کے لحاظ سے یہ حق رکھتا ہے کہ اس کے ساتھ تعرض نہ کیا جائے ۔ البتہ کفر کی وجہ سے حرمۃ تعرض قائم نہیں رہتی لہذا اس کا قتل مباح ہوتا ہے) ۔ اور اموال دیۃ تو نفس انسانی کے تابع ہیں اور نفس انسانی کے قیمتی ہونے کے لحاظ سے اموال اصل ہیں (یعنی اصل کی حیثیۃ عصمۃ کو حاصل نہیں بلکہ اموال کو حاصل ہے) کیونکہ کسی چیز کی قیمت لگانے سے یہ پتا

چاہتا ہے کہ جو چیز جاتی رہی اس کو پورا کیا جائے (یعنی جو انسان مار دیا گیا ہے اس کا معاوضہ دے کر جبر نقصان کیا جائے) اور جبر الغاية کی صورة اموال سے ممکن ہے نفوس سے نہیں . کیونکہ جبر نقصان کی یہ شرط ہے کہ جس چیز سے نقصان پورا کیا جا رہا ہے وہ زائل شدہ کی مثل ہو اور یہ بات مال میں تو موجود ہے نفس میں نہیں ، تو نفوس اموال کے تابع ہوں گے . (یعنی خون بہا دینے میں مال کو اصل کی حیثیة حاصل ہے اور نفس کو تابع کی) . پھر جس نفس محترم کا خون بہا مال سے دیا جاتا ہے اس کی شرط یہ ہے کہ وہ مال دارالاسلام کی وجہ سے محفوظ و مصون ہو . کیونکہ عزة و عصمة مسلمانوں کی قوة و شوکة سے (دارالاسلام میں) حاصل ہوتی ہے . پس یہی بات نفوس کے سلسلے میں بھی ہوگی (کہ جو نفوس دارالاسلام میں ہیں انہیں کو عزة و عصمة حاصل ہے) ، (اور دارالحرب کے کافروں میں رہتے ہوئے وہ عزة و منفعة حاصل نہیں ہو سکتی) کیونکہ شریعة نے کفار کی منفعة و عزة کو باطل قرار دیا ہے (یعنی بوجہ ان کے کفر و شرک کے) . لہذا کفار کی منفعة و عزة کا اعتبار ساقط ہوگا (یعنی اگر مسلمان دارالحرب میں رہتا ہے تو اس کی جان کو وہ منفعة حاصل نہ ہوگی جو دارالاسلام میں حاصل ہوتی ہے) . مرتد اور مستأمن جو ہمارے ملک یعنی دارالاسلام میں ہوں وہ حکماً حربیوں میں شمار ہوں گے ، کیونکہ ان کا اصل مقصد تو دارالحرب میں چلا جانا ہے .

(لہذا اگر مرتد یا مستأمن کو دارالاسلام میں بھی قتل کر دیا جائے تو ان کے قتل سے دیۃ اور قصاص واجب نہیں ہوتا) .

مسئلہ : اور جس شخص نے (دارالحرب میں) ایسے مسلمان کو خطاء سے قتل کیا جس کا کوئی والی نہیں ، یا ایسے حربی کو قتل کیا جو امان لے کر ہمارے یہاں آیا تھا اور اسلام لے آیا تھا ، تو قاتل کی برادری پر دیۃ ہوگی جو امام کے سپرد کی جائے گی اور قاتل پر کفارہ ہوگا . کیونکہ اس نے ایک معصوم جان کو خطاء سے قتل کیا ہے . تو اس کا قیاس تمام جانوں پر ہوگا جو معصوم ہیں . امام محمدؒ کے اس قول "للامام" (یعنی دیۃ امام کو دی جائے) کا مطلب یہ ہے کہ دیۃ لینے کا حق امام کو ہوگا . کیونکہ اس کا کوئی وارث نہیں ہے .

اگر وہ مذکورہ صورۃ میں جان بوجھ کر قتل کا ارتکاب کرے تو امام کو اختیار ہے کہ اگر چاہے تو قاتل کو قتل کر دے یا چاہے تو اس سے دیۃ لے لے . کیونکہ مقتول نفس معصوم تھا اور قتل عمداً کیا گیا ہے اور ولی بھی معلوم ہے ، یعنی وہ عامۃ المسلمین ہیں یا سلطان ہے . حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس کا کوئی ولی نہ ہو سلطان اس کا ولی ہے .

امام محمدؒ کے اس قول وَاِنْ شَاءَ اَخَذَ الدِّيَة (یعنی اگر چاہے تو دیۃ لے لے) کا معنی یہ ہے کہ بطریق صلح دیۃ

وصول کرے کیونکہ قتل عمد کی سزا تو قصاص ہے ۔ لیکن چونکہ اس مسئلے میں قصاص کی بہ نسبة دیة میں زیادہ نفع ہے ، لہذا سلطان کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ مال پر صلح کرلے ۔ البتہ امام اسے بالکل معاف نہیں کر سکتا کیونکہ حقیقةً تو تمام مسلمانوں کا حق ہے اور امام ان کی طرف سے والی ہوتا ہے اور اس کی ولایة بنظر مصلحة ہوتی ہے ۔ لیکن ان کا حق بغیر معاوضے کے مفت میں ساقط کر دینے میں کوئی مصلحة نہیں ۔ (لہذا اسے معاف دینے کا حق حاصل نہ ہوگا) ۔

بَابُ الْعُشْرِ وَالْخَرَاجِ

عُشر اور خِراج کا بیان

مسئلہ : امام قدوریؒ نے فرمایا : تمام سر زمین عرب عُشری زمین ہے ۔ جس کا حدود اربعہ یہ ہے کہ مقام عُذیب سے یمن میں مہرہ کے آخری پتھروں تک (طولاً) ہے ۔ اور عرض میں مہرہ کے ریگستان سے حد شام تک ہے ۔ اور سواد عراق کی زمین خراجی ہے اور وہ عذیب سے عقبۂ حلوان تک (عرضاً) اور طول میں ثعلبہ سے، بعض نے علث سے کہا، عبادان تک ہے ۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ اور خلفاء راشدین نے عرب کی اراضی سے خراج نہیں لیا تھا ۔ دوسری بات یہ ہے کہ خراج بمنزلۂ غنیمة ہوتا ہے ۔ لہذا خراج ان کی اراضی میں ثابت نہ ہوگا جیسے کہ ان کی گردنوں میں ثابت نہیں ہوتا ۔ کیونکہ خراج عاید کرنے کی شرط یہ ہے کہ اس ملک کے لوگ کفر پر قائم و برقرار ہیں ۔ جیسے کہ سواد عراق میں ہوا تھا اور مشرکین عرب سے سوائے اسلام یا تلوار کے فیصلے کے کوئی تیسری چیز قابل قبول نہیں ۔

اور جب حضرت عمرؓ نے سواد عراق کو فتح کیا تو صحابہ کرام کی موجودگی میں اس سر زمین پر خراج عاید

کیا گیا اور حضرت عمرو بن العاص رض نے مصر کو فتح کر کے خراج عاید کیا. اسی طرح صحابہ کرام رض کے اتفاق سے ملک شام پر خراج لگایا گیا.

مسئلہ : امام قدوری رح نے فرمایا : سواد عراق کی زمین اھالیان عراق ہی کی ملک میں ہے. انھیں فروخت کرنے اور اس میں تصرف کرنے کی پوری آزادی ہے. کیونکہ امام جب کوئی زمین قوۃ سے اور غلبے سے فتح کرے تو اسے اختیار ہے کہ ان لوگوں ہی کو اراضی پر برقرار رکھے اور اس زمین اور ان لوگوں پر خراج مقرر کر دے، تو اراضی ان لوگوں کی ملکیۃ ہی میں رہے گی. اور یہ بات تقسیم غنیمۃ کے باب میں بیان کی جا چکی ہے.

مسئلہ : امام قدوری رح فرماتے ہیں : ہر وہ زمین جس کے باشندے اسلام لے آئیں یا اسے قوۃ سے فتح کیا جائے اور مجاھدین میں تقسیم کر دی جائے تو یہ عُشری زمین ہوگی. کیونکہ ابتدائی لگان مقرر کرنے کی ضرورۃ ایک مسلمان کے سلسلے میں در پیش آئی اور مسلمان کے حق میں عُشر زیادہ مناسب ہے. کیونکہ عُشر میں عبادۃ کا پہلو بھی ہے نیز اس میں تخفیف و رعایۃ بھی ہے کیونکہ عُشر کا تعلق پیداوار سے ہوتا ہے.

مسئلہ : ہر وہ زمین جو قوۃ و غلبہ سے فتح کی جائے، لیکن وہاں کے لوگوں کی ملکیۃ اس پر برقرار رکھی جائے تو وہ خراجی زمین ہوگی. اسی طرح اگر ان لوگوں سے صلح کر لی

جائے (تو وہ بھی زمین کا خراج ادا کریں گے) کیونکہ ابتدائی لگان مقرر کرنے کی ضرورۃ ایک کافر کے سلسلے میں در پیش آئی ہے اور کافر کے حق میں خراج ہی زیادہ مناسب ہے۔ مگر مکہ مکرمہ اس حکم سے مستثنی قرار دیا گیا۔ کیونکہ رسول اکرم ﷺ نے اسے بزور شمشیر فتح کیا تھا اور اس کے اہالیان کو برقرار رکھا تھا اور خراج مقرر نہیں کیا گیا تھا۔

مسئلہ : امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں فرمایا : جو زمین بزور شمشیر فتح کی جائے اور وہ نہری پانی سے سیراب ہو وہ خراجی زمین ہے۔ اور جو نہری پانی سے سیراب نہ ہو، بلکہ چشمہ یا کنواں نکالا گیا ہو تو یہ عشری زمین ہوگی، کیونکہ عُشر کا تعلق پیداوار سے ہوتا ہے، پیداوار پانی سے ہوتی ہے۔ لہذا عُشر یا خراج مقرر کرنے میں پانی کا لحاظ ہوگا کہ عُشری پانی ہے یا خراجی پانی۔

مسئلہ : امام قدوریؒ نے فرمایا : جس نے مردہ زمین کو زندہ کیا (یعنی غیر مزروعہ زمین کو مزروعہ بنا لیا)۔ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اس کا محل وقوع دیکھا جائے گا۔ اگر اس کا محل وقوع خراجی زمین کے متصل ہے تو یہ خراجی ہوگی۔ اگر عشر زمین کے قرب و جوار میں ہے تو یہ عشری ہوگی۔ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک بصرہ کی ساری زمین عشری ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ کے نزدیک یہی متفق علیہ فیصلہ تھا۔ کیونکہ کسی چیز کے قرب و جوار

پر وہی حکم ہوتا ہے جو اس چیز پر ہوتا ہے۔ جیسے گھر کے آس پاس کی جگہ گھر کا حکم رکھتی ہے حتی کہ گھر کے مالک کو فناء دار سے نفع حاصل کرنا جائز ہوتا ہے۔ اسی طرح اس زمین کا لینا جائز نہیں جو آبادی کے قریب ہو۔

امام ابو یوسفؒ کے نزدیک بصرہ کی اراضی کے بارے قیاس یہ تھا کہ وہ خراجی ہو، کیونکہ وہ خراجی اراضی کے قرب و جوار میں ہے، لیکن چونکہ صحابہ کرامؓ نے اس پر عُشر مقرر کیا تھا تو ان کے اجماع کے پیش نظر قیاس کو چھوڑ دیا گیا۔

مسئلہ: امام محمدؒ نے فرمایا: مردہ زمین کو کنواں کھود کر، چشمہ نکال کر یا دریائے دجلہ و دریائے فرات جیسے قدرتی دریاؤں جن کا کوئی شخص مالک نہیں ہوتا کے پانی سے زندہ کیا تو یہ عُشری ہوگی۔ اسی طرح اگر اسے بارش کے پانی سے زندہ کرے تو بھی عُشری ہوگی۔ اور اگر اس زمین کو ان نہروں سے سیراب کیا جو ملوک عجم نے کھدائی تھیں جیسے نہر نوشیرواں اور نہر یزدگرد تو یہ خراجی زمین ہوگی۔ جیسا کہ ہم ذکر کرچکے ہیں کہ عشر یا خراج کا مدار پانی پر ہوتا ہے، کیونکہ پانی ہی پیداوار کا سبب ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ابتداء سے مسلمان پر زبردستی خراج مقرر کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ تو اس سلسلے میں پانی کا اعتبار کیا جائے گا کیونکہ جب اس نے خراجی پانی سے زمین کو سیراب کیا تو اس نے اپنے اوپر خراج کا التزام کر لیا۔

مسئلہ : اور جو خراج حضرت عمرؓ نے اہل عراق پر مقرر کیا تھا ۔ اس کا اندازہ یہ تھا کہ ہر جریب جو پانی سے سیراب کی جاتی ہے ، اس پر ایک قفیز ہاشمی یعنی ایک صاع اور ایک درہم ہے اور ہر جریب رطبہ پر پانچ درہم ۔ (رطبہ سے مراد کھیرا ، ککڑی ، خربوزہ اور بینگن وغیرہ ہے) ۔ اور ہر جریب انگور پر جو متصل ہو (یعنی درمیان میں کوئی کھیت نہ ہو) اسی طرح ہر جریب خرمہ پر جو متصل ہو دس درہم ہیں ۔ حضرت عمرؓ سے اسی طرح منقول ہے کہ آپ نے عثمان بن حنیف کو مأمور فرمایا کہ عراق کی زمینوں کی پیمائش کریں اور حضرت حذیفہؓ کو مشرف مقرر کیا ۔ انھوں نے پیمائش کی تو تین کروڑ ساٹھ لاکھ جریب رقبہ نکلا ، اور آپؓ نے اس پر اسی طرح محصول مقرر کیا جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے ۔ یہ سارا معاملہ حضرات صحابہؓ کی موجودگی میں طے ہوا تھا اور کسی نے اس کی مخالفت نہ کی ۔ توگویا یہ صحابہ کرامؓ کا اجماع تھا ۔ دوسری بات یہ ہے کہ مختلف اقسام کی پیداوار کی محنت و مشقت بھی متفاوة ہوتی ہے ۔ انگور پر سب سے کم محنت صرف ہوتی ہے ، اور غلوں کی پیداوار پر محنت اور اخراجات زیادہ ہوتے ہیں اور سبزیوں کی مشقت بین بین ہوتی ہے ۔ محصولات بھی محنت و اخراجات کے متفاوة ہونے سے متفاوة ہو جاتے ہیں ۔ پس انگور کا محصول زیادہ سے زیادہ مقرر کیا گیا اور اناج کے سلسلے میں کم سے کم اور سبزیوں پر بین بین ۔

مسئلہ : امام قدوریؒ نے فرمایا : ان مذکورہ اصناف کے علاوہ جو اشیاء پیداوار ہیں. مثلاً زعفران اور باغ وغیرہ تو ان پر طاقت اور پیداوار کے مطابق محصول ہوگا . کیونکہ اس سلسلے میں حضرت عمرؓ نے کوئی محصول مقرر نہیں فرمایا . اور اس سلسلے میں آپ نے طاقت اور آمدن کا اعتبار فرمایا . ہم بھی ایسی پیداوار کے سلسلے میں جس میں کوئی مقدار مقرر نہیں کی گئی ، طاقت اور آمدن کا لحاظ رکھیں گے . مشایخؒ نے فرمایا کہ انتہاء طاقت یہ ہے کہ محصول نصف پیداوار تک پہنچے ، اس سے زیادہ نہ ہو کیونکہ تنصیف عین انصاف ہے . اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں یہ اختیار بھی تو حاصل تھا کہ ہم تمام اراضی مجاہدین میں تقسیم کر دیتے (مگر ہم نے ایسا نہ کیا اور اصلی مالکوں کی ملکیۃ برقرار رکھی) . بستان ایسی اراضی کو کہا جاتا ہے جس کے ارد گرد چار دیواری ہو اور جس میں مختلف قسم کے کھجوروں کے درخت اور دوسرے پھل دار درخت ہوں . ہمارے علاقے میں ہر قسم کی اراضی پر درھموں کی صورۃ میں لگان مقرر کیا جاتا ہے اور اسی طرح رہے گا . کیونکہ اندازہ مقرر کرنے میں یہ امر ضروری ہے کہ طاقت کے مطابق مقرر کیا جائے . خواہ جس جنس سے بھی ہو (پیداوار ہی کا کچھ حصہ مقرر کر دیا جائے یا نقد روپیہ مقرر کیا جائے) .

مسئلہ : اگر زمین میں اتنی صلاحیت نہ ہو کہ اس سے مقررہ خراج کی ادائیگی ہو سکے (یعنی نصف پیداوار سے لگان

بڑھ جائے) ، تو امام خراج کی رقم کم کر دے اور پیداوار کی کمی کے موقع پر خراج میں کمی کر دینا بالاجماع جائز ہے . کیا آپ ارشاد عمرؓ کو نہیں دیکھتے کہ آپ نے حذیفہؓ اور ابن حنیفؓ سے کہا تھا کہ تم نے خراج اتنا تو مقرر نہیں کیا جس کی زمین میں طاقت ہی نہ ہو ؟ تو انہوں نے عرض کیا : نہیں - ہم نے تو اس قدر مقرر کیا ہے کہ جس کی زمین میں طاقت ہے . بلکہ اگر ہم کچھ اضافہ کر دیتے تو بھی وہ برداشت کر لیتی . اس آخری جملے سے ثابت ہوتا ہے کہ کمی کرنا جائز ہے .

اناج کی پیداوار زیادہ ہونے کی صورة میں امام محمدؒ کے نزدیک خراج میں اضافہ جائز ہے ، جیسا کہ کمی کی صورة میں نقصان جائز ہے .

امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اضافہ جائز نہیں کیونکہ حضرت عمرؓ نے اضافہ نہیں فرمایا . حالیکہ انہیں مطلع کر دیا گیا تھا کہ زمین میں ہمارے مقرر کردہ خراج سے زیادہ طاقت ہے .

مسئلہ : اگر خراجی زمین پر پانی چڑھ آئے یا پانی کا سلسلہ منقطع ہو جائے یا کسی آفت کی وجہ سے پیداوار ضائع ہو جائے تو اس پر خراج نہ ہوگا . کیونکہ زراعت سے نفع حاصل کرنا ممکن نہ رہا اور خراج میں یہی معتبر ہے کہ اس میں نمو تقدیری یعنی زراعت پر قابو حاصل ہو ، اور جب زراعت پر کوئی آفت آ جائے تو سال کے کچھ حصے میں نمو

تقدیری نہ پایا گیا ۔ اور خراج کے لیے اس کا پورا مال نامی ہونا شرط ہے ۔ جیسا کہ مال زکاۃ میں ہوتا ہے ۔ (کہ اس میں حولان حول شرط ہوتا ہے) ۔ یا حکم کا مدار نمو حقیقی پر ہوتا ہے جب کہ فصل اگ پڑے ۔ (یعنی نمو تقدیری نمو حقیقی کا قائم مقام ہوتا ہے ۔ جب فصل زمین سے اگ آئی تو نمو حقیقی پایا گیا اور خراج اس سے متعلق ہوگا ۔ لیکن جب آفت سے نمو حقیقی زائل ہوگیا تو خراج بھی جاتا رہا) ۔

مسئلہ : اگر زمین کا مالک اسے معطل چھوڑ دے تو اس پر خراج واجب ہوگا ۔ کیونکہ اسے زراعت پر قدرت و اختیار حاصل تھا اور اس نے یہ موقعہ خود ہی ضائع کیا ۔

مشایخؒ نے فرمایا : جس مالک نے جان بوجھ کر بغیر کسی عذر کے کمتر فصل بوئی (مثلاً زمین میں زعفران پیدا ہو سکتا تھا مگر اس نے باجرہ بو دیا) تو اس پر اعلی درجے کا خراج واجب ہوگا ، کیونکہ ان منافع کثیرہ کو اس نے خود ضائع کیا ہے ۔ اس حکم کا مدار عرف پر ہوگا ۔ فتوی نہ دیا جائے گا تاکہ ظالم حکام رعایا کے مال لینے پر جرأۃ مند نہ ہو جائیں ۔

مسئلہ : اگر اہل خراج میں سے کوئی شخص اسلام لے آئے تو اس سے حسب سابق خراج لیا جائے گا ، کیونکہ خراج میں مشقۃ و اخراجات کا پہلو مد نظر ہوتا ہے ۔ تو حالۃ بقاء میں بھی اسی مشقۃ اور اخراجات کا اعتبار ہوگا (کیونکہ بقاء ابتداء سے آسان ہوتی ہے) ، تو مسلمان پر اس کا باقی رکھنا ممکن ہے (اگرچہ ابتداءً مسلمان پر خراج نہیں لگایا جا سکتا) ۔

مسئلہ : جائز ہے کہ مسلمان خراجی زمین ذمی سے خرید لے اور اس سے خراج ہی لیا جائے۔ جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں۔ اور یہ بات پایۂ صحت کو پہنچ چکی ہے کہ صحابہ کرامؓ نے خراجی اراضی کی خریداری کی اور وہ خراج ادا کیا کرتے تھے۔ تو اس سے ثابت ہوا کہ خراجی اراضی کا خریدنا اور اس سے خراج لینا جائز ہے اور مسلمان کو خراج کا ادا کرنا بلا کراھة جائز ہے۔

مسئلہ : خراجی زمین کی پیداوار میں عشر نہیں ہوتا بلکہ خراج ہی ادا کیا جاتا ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ عشر و خراج دونوں کو جمع کیا جائے گا۔ کیونکہ یہ دو مختلف حق ہیں جو مختلف اسباب کی بناء پر دو الگ الگ مقام میں واجب ہوتے ہیں۔ لہذا ان کے جمع کرنے میں کوئی منافات نہیں۔

ہماری دلیل آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ مسلمان کی زمین میں عشر اور خراج جمع نہیں ہو سکتے۔ دوسرے بات یہ ہے کہ ائمہ مسلمین میں سے کسی نے بھی خواہ عادل تھا یا ظالم دونوں کو جمع نہیں کیا۔ تو ان کا یہ اجماع حجة سے کیا کم ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ خراج اس زمین پر واجب ہوتا ہے جو بزور شمشیر فتح کی جائے اور عشر اس زمین میں ہوتا ہے کہ جس کے مالک برضاء و رغبة خود اسلام قبول کرلیں۔ اور یہ دونوں اوصاف ایک زمین میں جمع نہیں ہو سکتے اور دونوں حق ایک ہی سبب سے تعلق رکھتے

ہیں ۔ یعنی نشو و نماء کے قابل زمین، البتہ عُشر حقیقی پیداوار پر ہوتا ہے اور خراج تقدیری پیداوار پر (یعنی جہاں قدرت زراعت موجود ہو) ۔ لہذا یہ دونوں یعنی عشر و خراج زمین کی طرف مضاف ہوتے ہیں ۔ (یعنی عُشر الأرض اور خراج الأرض کہا جاتا ہے) ایسا ہی اختلاف زکاۃ کے ساتھ عشر یا خراج جمع کرنے کی صورۃ میں ہے ۔ (یعنی اگر عشری یا خراجی زمین تجارت کی غرض سے خریدے تو اس میں عشر یا خراج ہوگا ساتھ زکاۃ نہ ہوگی) ۔

مسئلہ : ایک سال میں دوبار پیداوار ہونے سے خراج متکرر نہ ہوگا (بلکہ خراج صرف ایک بار لیا جائے گا) ۔ کیونکہ حضرت عمرؓ نے خراج کو مکرر نہیں فرمایا ۔ بخلاف عُشر کے کیونکہ عُشر کا تحقق تو اسی وقت ہوتا ہے جب کہ پیداوار کا تحقق ہو (تو سال میں جتنی بار پیداوار ہوگی اتنی ہی بار عُشر بھی ہوگا) ۔

بَابُ الْجِزْيَةِ

جزیہ کے بیان میں

مسئلہ : جزیہ کی دو قسمیں ہیں ۔ ایک قسم یہ ہے کہ جو جزیہ باہمی رضا مندی اور صلح سے مقرر کیا جائے۔ اور اس کی مقدار اتنی ہی ہوگی جتنی پر دونوں فریقوں کا اتفاق ہوا ہے جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے اہل نجران کے ساتھ ایک ہزار دو سو حلہ پر صلح فرمائی تھی ۔ دوسری بات یہ ہے کہ جزیہ کا موجب باہمی رضا مندی ہے تو جس امر پر باہمی اتفاق ہوا ہے اس سے تجاوز جائز نہ ہوگا ۔

جزیہ کی دوسری قسم وہ ہے جو امام المسلمین ابتداء کر کے مقرر کرے ۔ یعنی جب امام کفار پر غلبہ حاصل کرے اور ان کی جائیدادوں کو بحال رکھے ۔ پس اس دولت مند پر جس کی دولت مندی واضح ہے اڑتالیس درہم سالانہ مقرر کرے گا اور ہر ماہ ان سے چار درہم لیے جائیں گے اور متوسط الحال شخص پر چوبیس درہم سالانہ ہوں گے اور ہر ماہ دو درہم وصول کیے جائیں گے ۔ اور اس پر جس کے پاس روپیہ جمع نہیں لیکن وہ اپنے روزانہ اخراجات سے زیادہ کما لیتا ہے بارہ درہم سالانہ ہوں گے اور ہر ماہ ایک درہم

وصول کیا جائے گا ۔ یہ احناف کا مسلک ہے ۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں، ہر بالغ پر ایک دینار یا اس کے مساوی رقم ہوگی اور اس میں امیر و غریب برابر ہوں گے ۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت معاذؓ سے فرمایا تھا : ہر بالغ مرد اور بالغہ عورت سے ایک دینار یا اس کے مساوی معافر لینا ۔ (حالمة کے معنی بالغ عورت ہے ۔ مگر عورت سے جزیہ نہیں لیا جاتا ہے ، لہذا روایۃ میں یہ لفظ غلط ہے ۔ کیونکہ بہت سی دیگر روایات میں حالمة کا لفظ نہیں ہے یا ممکن ہے ابتداءً یہ حکم ہو اور بعد میں منسوخ ہوگیا ہو) ۔ (معافر یمنی کپڑے کی ایک قسم تھی) ۔ اور آپ نے کوئی تفصیل ذکر نہیں کی (کہ امیر سے لینا ہے یا غریب سے) ۔ دوسری بات یہ ہے کہ جزیہ قتل کے بدلے میں واجب ہوتا ہے ، حتی کہ جس شخص کا بوجہ کفر قتل جائز نہ ہو اس پر جزیہ واجب نہیں ہوتا ۔ جیسے چھوٹے بچے اور عورتیں ۔ اور یہ بات فقیر و غنی دونوں کو شامل ہے (کیونکہ اگر ان پر جزیہ واجب نہ کیا جاتا تو انھیں قتل کر دیا جاتا) ۔

ہمارے مسلک کی تائید حضرت عمرؓ ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے ارشادات سے ہوتی ہے اور ان کے فیصلے پر مہاجرین اور انصار میں سے کسی نے بھی انگلی نہیں اٹھائی تھی ۔ دوسری بات یہ ہے کہ جزیہ کا وجوب مجاہدین کی مدد و نصرۃ کے پیش نظر ہے ۔ تو خراج زمین کی طرح جزیہ بھی متفاوۃ طور پر واجب ہوگا ۔ کیونکہ جزیہ جان

و مال کی مدد اور حفاظت کے بدلے واجب ہوا ہے اور حفاظت و مدد مال کی کثرت اور قلت کے پیش نظر متفاوۃ ہوتی ہے. لہذا اس کا بدل یعنی جزیہ بھی متفاوۃ ہوگا اور جو روایت امام شافعیؒ نے پیش کی ہے وہ صلح کی صورۃ پر محمول ہوگی. اسی وجہ سے تو آپ نے بالغہ عورت سے بھی جزیہ لینے کا حکم دیا تھا اگرچہ اصولاً عورت سے جزیہ نہیں لیا جاتا.

مسئلہ: امام قدوریؒ نے فرمایا: اہل کتاب اور مجوس پر بھی جزیہ مقرر کیا جائے گا کیونکہ ارشاد باری تعالی ہے:

مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ

التوبہ: ۲۹ (ان لوگوں سے جنہیں کتاب دی گئی ہے (ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں) اور نبی اکرم ﷺ نے مجوس پر جزیہ مقرر فرمایا تھا.

مسئلہ: امام قدوریؒ نے فرمایا: عجم کے بت پرستوں پر بھی جزیہ ہوگا. (عرب کے بت پرستوں کے لیے تو اسلام یا تلوار کا فیصلہ تھا) اس میں امام شافعیؒ کا اختلاف ہے. وہ فرماتے ہیں: اللہ تعالی کے ارشاد وَقَاتِلُوْهُمْ کے پیش نظر کفار سے قتال واجب ہے. (اور اس میں عرب و عجم کے لوگ اور اہل کتاب وغیرہ سب شامل ہیں). اہل کتاب کے حق میں ترک قتال کا حکم ہمیں کتاب الہی سے پتا چلا. (یعنی حتی یعطوا الجزیۃ الآیۃ) اور مجوس کے حق میں ترک

قتال کا حکم حدیث سے معلوم ہوا ہے . ان دو کے علاوہ باقی میں اصلی حکم یعنی قتال جاری ہوگا .

احناف کہتے ہیں کہ بت پرستوں اور مشرکین کو غلام بنانا جائز ہے . تو ان پر جزیہ لگانا بھی جائز ہوگا کیونکہ غلام بنانے یا جزیہ لگانے کی صورة میں ان کا سلب نفس لازم آتا ہے . (یعنی حریة چھن جانے سے گویا ان کی ذات ہی چھن گئی) چنانچہ وہ کمائی کرکے مسلمانوں کو ادائیگی کرتے ہیں اور ان کے اخراجات ان کی اپنی کمائی سے پورے ہوتے ہیں .

مسئلہ : مسلمان اگر بت پرستوں پر جزیہ کی تقرری سے پہلے ہی غالب آ جائیں تو ان کی عورتیں اور بچے مال غنیمة میں شمار ہوں گے . کیونکہ ان کا غلام بنا لینا جائز ہے . عرب کے بت پرستوں اور مرتدین (خواہ عرب کے ہوں یا عجم کے) پر جزیہ نہ لگایا جائے گا کیونکہ ان کا کفر بہت شدید ہے .

مشرکین عرب کا کفر تو اس وجہ سے کہ نبی اکرم ﷺ ان لوگوں کے درمیان مبعوث ہوئے اور قرآن کریم ان کی زبان میں نازل ہوا تو ان کے حق میں یہ معجزہ بالکل واضح ہے .

مرتد کا کفر اس وجہ سے شدید ہوا کہ اللہ تعالی نے اسے اسلام کی ہدایت کی تھی اور وہ مخالفین اسلام سے بخوبی آگاہ ہوگیا تھا . مگر اس نے ہدایت یافتہ ہونے کے بعد اپنے رب کے ساتھ کفر کیا . تو ان دونوں فریقوں سے سوائے

اسلام یا تلوار کے کچھ بھی قبول نہ کیا جائے گا۔ تاکہ (اسلام نہ لانے کی صورۃ میں) سخت سزا کا مزا چکھیں۔ امام شافعیؒ کے نزدیک مشرکین عرب کو غلام بنانا جائز ہے۔ مگر ہماری دلیل ان کے خلاف حجۃ ہے۔

مسئلہ: اور جب مجاہدین نے مشرکین عرب یا مرتدین پر غلبہ پا لیا تو ان کی عورتیں بچے غنیمۃ ہوں گے۔ کیونکہ جب قبیلۂ بنی حنیف نے ارتداد اختیار کیا تھا، تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا تھا اور انہیں مجاہدین میں تقسیم فرما دیا تھا۔

اور ان کے مردوں سے جو اسلام قبول نہ کرے گا، اسے قتل کر دیا جائے گا۔ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے اور عورتوں اور بچوں پر جزیہ نہ ہوگا۔ کیونکہ جزیہ تو قتل کے بدلے واجب ہوتا ہے یا مجاہدین کے قتال کے سلسلے میں معاونت ہوتی ہے اور عورتوں اور بچوں کو قتل نہیں کیا جاتا۔ اور ان کی عدم اہلیۃ کی بناء پر ان سے جنگ بھی نہیں کی جاتی۔

مسئلہ: امام قدوریؒ نے فرمایا: اپاہج اور اندھے شخص پر بھی جزیہ نہ ہوگا۔ اسی طرح مفلوج اور بوڑھے پر بھی نہ ہوگا جیسا ہم نے ذکر کیا ہے (کہ عورتوں اور بچوں کو قتل نہیں کیا جاتا اور نہ وہ لڑنے کی اہلیۃ رکھتے ہیں)۔ امام ابو یوسفؒ سے ایک روایت ہے کہ جب وہ مال دار ہو تو اس پر جزیہ واجب ہوگا کیونکہ فی

الجملہ وہ لڑائی میں شامل ہوتا ہے جب کہ وہ امور حرب میں بصیرۃ رکھتا ہو .

اور ایسے فقیر پر بھی واجب نہ ہوگا جس کی کمائی اس کی ضروریات سے کم ہو یا وہ کمانے کے قابل ہی نہ ہو . اس میں امام شافعیؒ کو اختلاف ہے ان کی دلیل حضرت معاذؓ کی مطلق روایت ہے .

ہماری دلیل یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس فقیر پر کوئی جزیہ مقرر نہ فرمایا جو کمائی کے قابل نہ تھا اور یہ سب کچھ صحابہ کرامؓ کی موجودگی میں ہوا تھا . دوسری بات یہ ہے کہ جس زمین میں پیداواری طاقت ہی نہ ہو اس پر خراج بھی مقرر نہیں کیا جاتا . اسی طرح یہ خراج (یعنی جزیہ) بھی عدم طاقت کی صورۃ میں مقرر نہ کیا جائے گا اور حدیث کمائی کرنے والے شخص پر محمول ہے .

مسئلہ : غلام ، مکاتب ، مدبر اور ام ولد پر بھی جزیہ نہ ہوگا کیونکہ جزیہ کفار کے حق میں قتل کا بدلہ ہے اور ہمارے حق میں نصرۃ کا بدلہ ہے ۔ اور امر ثانی کے اعتبار سے واجب نہیں ہو سکتا ؛ لہذا شک کی بناء پر واجب ہی نہ ہوگا ۔ (یعنی وجوب جزیہ کے دو سبب ہیں ۔ اول یہ کہ یہ قتل کا بدلہ ہے . اگر اس امر کا اعتبار کریں تو غلاموں پر بھی جزیہ واجب ہونا چاہیئے کیونکہ مملوک بھی لڑائی میں حصہ لینے کی استطاعت رکھتے ہیں تو ان کا بدلہ بھی ہونا چاہیئے . دوم یہ ہے کہ نصرۃ کا بدلہ ہے بطور اعلاء نصرۃ

کی اھلیۃ سے محروم ہوتا ہے ۔ تو اس پر بدلہ بھی واجب نہ ہونا چاہیے تو اس شک کی بناء پر ان پر جزیہ نہ لگایا جائے گا) ۔

اور ان کی طرف سے ان کے آقا بھی ادا نہ کریں گے ۔ کیونکہ غلاموں کی وجہ سے ان کی حیثیت سے زیادہ ان پر بوجھ پڑ جاتا ہے ۔

مسئلہ : اور ان راھبوں پر بھی جزیہ نہ ہوگا جو لوگوں سے میل جول منقطع کیے ہوئے ہیں ۔ امام قدوریؒ نے یہاں اسی طرح ذکر کیا ہے ۔ لیکن امام محمدؒ نے امام ابو حنیفہؒ سے بیان کیا ہے کہ اگر وہ کام کاج کرنے کے قابل ہوں تو ان پر بھی جزیہ لگایا جائے گا اور امام ابو یوسفؒ کا بھی یہی قول ہے ۔ ان پر جزیہ لگانے کی وجہ یہ ہے کہ کمائی کی قدرۃ انھوں نے خود ضائع کی ہے تو یہ خراجی زمین کو معطل کر دینے کی طرح ہوگا ۔

ان پر جزیہ نہ لگانے کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ لوگوں سے میل جول نہ رکھتے ہوں تو انہیں قتل کرنا بھی واجب نہیں اور کفار کے حق میں جزیہ اسقاط قتل کی بناء پر ہوتا ہے ۔ اور کمائی کرنے والے فقیر کے بارے میں یہ ضروری ہے کہ وہ تندرست ہو اور سال کے اکثر حصے میں صحت کا برقرار رہنا کافی ہے ۔

مسئلہ : اگر ذمی اسلام لے آیا اور اس پر جزیہ واجب تھا تو اسلام لانے سے ساقط ہو جائے گا اور اسی طرح اگر

بحالت کفر مر جائے (یعنی اگر سال کے دوران مر جائے تو جزیہ ساقط ہوگا) امام شافعیؒ کو دونوں صورتوں میں اختلاف ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ جزیہ تو حفاظت اور رہائش کے عوض واجب ہوا تھا، اور حفاظت اور سکونت کا فائدہ تو وہ حاصل کر چکا ہے تو اس عارضے (یعنی اسلام یا موت) کی بناء پر وہ عوض ساقط نہ ہوگا۔ جیسا کہ کرائے اور عمداً قتل کی دیة پر صلح میں ہوتا ہے (مثلاً ایک ذمی کرائے پر مکان لے، پھر اسلام لے آئے یا مر جائے تو مکان کا کرایہ ساقط نہیں ہوتا۔ اسی طرح اگر ذمی کسی کو عمداً قتل کر دے اور مقتول کے وارثوں اور ذمی کے درمیان دیة پر صلح ہو جائے تو اسلام لانے یا مر جانے کی صورة میں دیة ساقط نہ ہوگی)۔

ہماری دلیل حضور ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ مسلمان پر جزیہ نہیں ہوتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ جزیہ کفر کی سزا کے طور پر واجب ہوتا ہے اور اسی لیے اسے جزیہ کہا جاتا ہے۔ جزیہ اور جزاء ایک ہی چیز ہے اور کفر کی سزا اسلام لانے سے ساقط ہوگئی اور موت کی صورة میں بھی سزا ممکن نہ رہی۔ تیسری بات یہ ہے کہ دنیا میں کفر کی سزا اس لیے مشروع ہے کہ کفر کے شر کو دور رکھا جا سکے (یعنی کافر کوئی فتنہ و فساد برپا نہ کر سکے) اور مر جانے کے بعد یا اسلام قبول کر لینے کے بعد فتنہ و فساد برپا کرنے کا امکان بھی جاتا رہا۔ چوتھی بات یہ ہے کہ جزیہ

کا واجب ہونا ہمارے حق میں نصرۃ کا عوض ہے (عصمۃ یا رہائش کا عوض نہیں ہے) اور اسلام لانے کے بعد اسے اپنی عصمۃ پر خود قدرت حاصل ہوگئی ہے۔

رہا عصمۃ اور سکونۃ کا معاملہ تو عصمۃ اس کے آدمی ہونے کی بناء پر ثابت ہے اور جس مکان میں وہ سکونت پذیر ہے وہ اس کا بذات خود مالک ہے۔ لہذا عصمۃ اور رہائش کا بدل واجب کرنے کے کوئی معنی نہیں رہتے۔

مسئلہ: اگر ذمی سے ایک سال جزیہ نہ لیا اور دوسرا سال بھی مکمل ہوگیا تو جزیہ میں تداخل ہو جائے گا (یعنی صرف ایک جزیہ لیا جائے گا اور الجامع الصغیر میں مذکور ہے۔ کہ جس سے جزیہ نہ لیا حتی کہ پورا سال گزر گیا اور دوسرا سال بھی شروع ہوگیا تو اس سے سال گزشتہ کا جزیہ نہیں لیا جائے گا۔ یہ امام ابو حنیفہؒ کی رائے ہے۔ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ اس سے لیا جائے گا، اور امام شافعیؒ کا بھی یہی قول ہے۔

اگر وہ سال کی تکمیل کے وقت مر جائے تو بالاتفاق اس سے جزیہ نہیں لیا جائے گا۔ اسی طرح اگر اثناءِ سال میں مر جائے (تو متفقہ طور پر یہی حکم ہوگا)۔

مسئلہ موت کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ بعض حضرات نے کہا کہ زمین کے خراج میں اسی طرح اختلاف ہے۔ لیکن بعض فقہاء کا کہنا ہے کہ خراج کے سلسلے میں بالاتفاق تداخل نہ ہوگا۔

اختلافی مسئلے کی صورۃ میں صاحبین؄ کی دلیل یہ ہے کہ خراج (یعنی جزیہ) عوض کے طور پر واجب ہوتا ہے اور جب کئی عوض اکھٹے ہو جائیں اور ان کا پورے طور پر وصول کرنا ممکن ہو تو وصول کر لیے جائیں گے. اور زیر بحث صورۃ میں دو سال گزرنے کے بعد وصول کرنا ممکن ہے (کیونکہ وہ کفر پر قائم ہے). بخلاف اس صورۃ کے جب وہ اسلام لے آئے تو وصول کرنا جائز نہ ہوگا.

امام ابو حنیفہ؄ فرماتے ہیں: جیسا ہم بتا چکے ہیں کہ جزیہ اصرار علی الکفر کی سزا کے طور پر واجب ہوتا ہے. اسی بناء پر اگر وہ جزیہ خود لانے کی بجائے اپنے نائب کے ہاتھ بھیج دے تو سب سے صحیح روایت کے مطابق اس سے قبول نہیں کیا جائے گا، بلکہ اسے مجبور کیا جائے گا کہ بذات خود لے کر آئے اور کھڑا ہو کر پیش کرے جب کہ امام یا اس کا نائب بیٹھا ہوا ہو. اور ایک روایت میں یوں ہے کہ جزیہ وصول کرنے والا اسی کا کپڑا گردن کے پاس سے پکڑے (یعنی گریبان سے پکڑے) اور اسے اچھی طرح جھٹکا دے کر کہے کہ اے ذمی جزیہ کی ادائیگی کر. اور کہا گیا ہے کہ اللہ کے دشمن کہہ کر خطاب کرے. تو ثابت ہوا کہ جزیہ سزا کے طور پر واجب ہوتا ہے اور جب کئی سزائیں اکھٹی ہو جائیں تو حدود کی طرح ان میں تداخل ہو جاتا ہے.

دوسری بات یہ ہے کہ جزیہ ان کے حق میں قتل کے

بدلے میں واجب ہوتا ہے اور ہمارے حق میں نصرة کا بدل ہوتا ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے ۔ لیکن اس قتل کا تعلق مستقبل سے ہوتا ہے نہ کہ ماضی سے ۔ کیونکہ قتل کا وجود اسی وقت ہوتا ہے کہ فی الحال جنگ جاری ہو گذشتہ لڑائیوں کے لیے نہیں ہوتا، اور اسی طرح نصرة کا تعلق بھی ماضی سے نہیں ہوتا بلکہ مستقبل سے ہوتا ہے ، کیونکہ زمانہ ماضی کے فتنہ سے تو کفایة ہو چکی ہے ۔

جزیہ کے بارے میں الجامع الصغیر میں امام محمدؒ کا یہ قول وَجَاءَتْ سَنَةٌ اُخْرٰی (یعنی دوسرا سال آ گیا) اسے بعض مشایخ نے مجاز کے طور پر سال گزرنے پر محمول کیا ہے (یعنی دوسرا سال گزر گیا)، کیونکہ وجوب سال کے آخر میں ہوتا ہے ۔ لہٰذا سال کا گزرنا ضروری ہے تاکہ اجتماع کا تحقق ہو اور تداخل ہو سکے ۔

اور بعض حضرات کے نزدیک امام محمدؒ کے قول کے حقیقی معنی ہی مراد ہوں گے اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ابتداءِ سال ہی میں جزیہ واجب ہو جاتا ہے تو سال کے شروع ہوتے ہی اجتماع کا تحقق ہو جائے گا ۔

اور صحیح یہ ہے کہ ہمارے نزدیک نفس وجوب ابتداءِ سال ہی سے ہو جاتا ہے اور امام شافعیؒ کے نزدیک زکاة پر اعتبار کرتے ہوئے سال کے آخر میں وجوب ہوگا ۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ جزیہ جس چیز کا بدل ہے (یعنی (قتل اور نصرۃ کا) اس کا تحقق مستقبل میں ہوتا ہے جیسا کہ ہم پہلے ثابت کر چکے ہیں . لہذا اس کا وجوب سال گزرنے کے بعد ممکن نہ ہوگا سو ہم نے ابتداءِ سال میں واجب کر دیا .

فصلؐ

ذمیوں کے متعلق بعض احکام کا بیان

مسئلہ : دارالاسلام میں نئے سرے سے بیعہ یا کنیسہ بنانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ (یہود و نصاری کے معبدوں کو بیعہ یا کنیسہ کہا جاتا ہے۔ بعض جگہ معبد یہود کو کنیسہ اور معبد نصاری کو بیعہ کہا جاتا ہے۔ مصر وغیرہ میں فریقین کے معبد کے لیے کنیسہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور دیر کا لفظ معبد نصاری کے لیے مخصوص ہے حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ اسلام میں نہ تو خصی ہونا ہے اور نہ کنیسہ ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ نئے سرے سے تعمیر کی اجازت نہ ہوگی۔

اگر پرانا بیعہ یا کنیسہ منہدم ہو جائے تو اس کی تعمیر نو کر سکتے ہیں۔ کیونکہ عمارات ہمیشہ باقی نہیں رہا کرتیں۔ اور جب امام نے ذمیوں کو دارالاسلام میں بحال رکھا تو گویا دوبارہ تعمیر کا عہد کر لیا۔ البتہ ان کو یہ اجازت نہ ہوگی کہ اسے شہر میں کسی دوسری جگہ منتقل کریں۔ اور تنہائی کا عبادت خانہ جسے صومعہ کہا جاتا ہے

بھی بیعہ کا حکم رکھتا ہے . (لہذا اس کی تعمیر کی اجازت بھی نہ ہوگی) ہاں اگر اپنے گھروں میں عبادت کی کوئی جگہ بنالیں تو جائز ہے کیونکہ وہ سکونت کے تابع ہے .

یہ ممانعت (یعنی تعمیر بیعہ و کنیسہ کی) شہروں میں ہے گاؤں میں نہیں ہے ، کیونکہ شعائر اسلام کا قیام عموماً شہروں میں ہوتا ہے . لہذا شعائر اسلام کی مخالف چیزوں کا اظہار کرکے اس کے ساتھ معارضہ نہیں کیا جائے گا .

شمس الائمہ سرخسیؒ فرماتے ہیں : ہمارے علاقے میں تو گاؤں میں بھی ممانعت ہوگی . کیونکہ گاؤں میں بھی بعض شعائر اسلام کا قیام ہوتا ہے اور امام مذہب ابو حنیفہؒ سے جواز کی روایت کوفہ کے دیہات میں ہے کیونکہ ان کے اکثر اہالیان اہل ذمہ ہیں . البتہ سر زمین عرب میں شہر ہوں یا دیہات ہر جگہ ممانعت ہوگی . نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جزیرۂ عرب میں دو دین اکھٹے نہیں ہو سکتے .

اور ذمیوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے لباس ، سواری ، زین اور ٹوپی وغیرہ میں مسلمانوں سے الگ اور متمیز ہوں . پس نہ تو گھوڑے کی سواری کریں اور نہ ہی ہتھیار لگا کر چلیں .

الجامع الصغیر میں مذکور ہے کہ ذمی لوگوں کا فرض ہے کہ وہ زنار کو ظاہری طور پر استعمال کریں اور ایسی زین زیر استعمال لائیں جو عموماً خچروں اور گدھوں پر

بصورت پالان استعمال کی جاتی ہے۔ اور یہ اس لیے لازم ہے کہ ان کی ذلت کا اظہار ہوتا رہے اور کمزور عقائد کے مسلمان محفوظ رہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ مسلمان قابل احترام ہوتا ہے اور ذمی قابل اہانت۔ اور مسلمان انہیں سلام کرنے میں ابتداء نہ کریں اور گلی سے گزرتے وقت انہیں تنگ راستہ دیں۔ اگر ان کی مختص قسم کی علامت نہ ہو تو ممکن ہے ان کے ساتھ مسلمانوں کا سا سلوک ہوتا رہے اور یہ جائز نہیں ہے۔

اور علامت کے طور پر واجب ہے کہ سوت یا اون کا ایک موٹا سا ڈورا ہو جو اپنی کمر کے ساتھ باندھیں اور ریشمی زنار نہ ہو۔ کیونکہ یہ اہل اسلام کے حق میں ظلم ہوگا۔ اور یہ بھی ضروری ہے کہ ذمیوں کی عورتیں ہماری عورتوں سے راستوں اور حماموں کے لحاظ سے متمیز ہوں اور ان کے گھروں پر نشانات لگا دیے جائیں تاکہ سائل کہیں ان کے دروازوں پر کھڑا ہوکر ان کے لیے مغفرت کی دعاء نہ کرے۔

ہمارے مشایخ کا ارشاد ہے کہ ذمیوں کو سوائے ضرورۃ کے سواری کی اجازت نہ ہو۔ اور جب کسی ضرورت کے تحت سواری کریں۔ تو جہاں مسلمانوں کا اجتماع ہو وہاں سواری سے اتر آئیں۔ اور اگر ان کو ضرورت ہو تو اسی طرح کی زین بنائیں جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ نیز انہیں اس بات کی اجازت نہ ہوگی کہ وہ علماء، زاھدوں اور اشراف جیسا لباس زیب تن کریں۔

مسئلہ : اور جس ذمی نے جزیہ کی ادائیگی سے انکار کیا یا کسی مسلمان کو قتل کر دیا ، یا حضور ﷺ کی شان میں ناروا الفاظ کہے یا مسلمان عورت سے زناء کیا ، تو اس کا ذمی ہونے کا معاہدہ نہیں ٹوٹے گا . کیونکہ وہ غایة جس پر قتال کا اختتام ہوتا ہے ، وہ یہ ہے کہ اپنے اوپر جزیہ کا التزام کر لے اور عدم ادائیگی کی صورة میں التزام جزیہ کافی ہوتا ہے .

امام شافعیؒ فرماتے ہیں : حضور علیہ الصلاة والسلام کی شانِ اقدس میں گستاخی سے معاہدہ ٹوٹ جائے گا . کیونکہ اگر خدانخواستہ مسلمان ایسی حرکت کرے تو اس کا ایمان جاتا رہتا ہے . اسی طرح اس کو دی ہوئی امان بھی ٹوٹ جائے گی کیونکہ عقد ذمہ ایمان کے قائم مقام ہے .

ہماری دلیل یہ ہے : کہ حضور ﷺ کی شان اقدس میں گستاخی کفر ہے اور ذمی بناتے وقت جو کفر اس میں موجود تھا وہ اس معاہدہ سے مانع نہیں تھا . تو یہ کفر جو اب طاری ہو رہا ہے یہ عہد ذمہ کو ساقط نہیں کرے گا .

مسئلہ : اور عہد ذمہ اس وقت تک برقرار رہے گا جب تک کہ ذمی دارالحرب میں جاکر کفار سے نہ مل جائے . یا ذمی کسی جگہ مسلمانوں پر غالب آکر ان سے لڑائی چھیڑ دیں . کیونکہ جب وہ ہم سے لڑنے لگے تو عہد ذمہ بے کار ہو کر رہ گیا . کیونکہ معاهدہ تو لڑائی کے شر کے ازالہ کے لیے تھا

مسئلہ : اور جب ذمی خود نقض عہد کرے تو وہ مرتد کی طرح ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس پر مرتد کے احکام جاری ہوں گے۔ کہ دارالحرب والوں کے ساتھ مل جانے سے اس کی موت کا حکم صادر کیا جائے گا کیونکہ وہ بے ایمان مردہ لوگوں سے جا ملا، اور اس کے اس مال کا حکم بھی جو وہ اپنے ساتھ لے گیا ہے مرتد جیسا ہوگا (یعنی اگر مسلمان وہاں غالب آ جائیں تو اس کا مال غنیمۃ شمار ہوگا)۔ البتہ اگر وہ گرفتار ہو جائے تو اسے غلام بنایا جائے گا بخلاف مرتد کے (کیونکہ مرتد کے سامنے یا تو اسلام پیش کیا جاتا ہے یا اسے حکم تلوار قبول کرنا پڑتا ہے)۔

فَصْلٌ

نصاری بنی تغلب کا بیان

(یہ لوگ عربی النسل تھے جاھلیة میں انھوں سے نصرانیة قبول کر لی تھی . حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں ان سے جزیہ طلب کیا . مگر انھوں نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ ہم عرب ہیں ، ہم سے وہی کچھ لیا جائے جو دیگر عربوں سے لیا جاتا ہے . مگر آپ کے راضی نہ ہونے پر ان میں سے کچھ لوگ بھاگ کر روم چلے گئے . نعمان بن زرعہ نے کہا : حضرت یہ جنگی قوم ہے یہ رومیوں کی تقویة کا باعث ہوں گے ، یہ جزیہ دیتے ہوئے عار محسوس کرتے ہیں . آپ ان سے صدقے کے نام پر ہی لے لیں . چنانچہ حضرت عمرؓ نے انھیں بلا بھیجا اور مسلمانوں سے جو لیا جاتا تھا باتفاق صحابہؓ اس سے دو چند مقرر کر دیا) .

مسئلہ : بنی تغلب کے نصاری سے اس مقدار کا دو چند لیا جائے کا جو بطور زکاۃ مسلمانوں سے لیا جاتا ہے . کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ نے باتفاق صحابہ رضوان اللہ ان سے اسی امر پر صلح کی تھی .

مسئلہ : ان کی عورتوں سے بھی لیا جائے اور ان کے بچوں سے کچھ نہ لیا جائے گا۔ کیونکہ صلح دو چند صدقہ پر ہوئی تھی اور صدقہ عورتوں پر تو واجب ہوتا ہے مگر بچوں پر نہیں ہوتا ۔

امام زفرؒ فرماتے ہیں : ان کی عورتوں سے بھی نہیں لیا جائے گا اور امام شافعیؒ کا بھی یہی قول ہے ۔ کیونکہ یہ دراصل تو جزیہ تھا جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ نے فرمایا : ہوگا تو یہ جزیہ مگر تم جو نام چاہو رکھ لو ۔ اسی بناء پر اسے مصارف جزیہ میں خرچ کیا جاتا ہے اور عورتوں پر جزیہ نہیں ہوا کرتا ۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ یہ ایسا مال ہے جو بسبب صلح واجب ہوا ہے اور عورت پر بھی اس قسم کا مال واجب کیا جا سکتا ہے ۔ اس کا مصرف مصالح مسلمین ہیں ۔ کیونکہ یہ بیت المال کا مال ہے اور یہ مصرف جزیہ کے ساتھ خصوصیت نہیں رکھتا ۔ کیا آپ دیکھتے نہیں اس میں جزیہ کی شرائط کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا ؟

مسئلہ : تغلبی کے غلام پر خراج یعنی جزیہ عائد کیا جائے گا ، اور زمین کا خراج بھی قریشی یعنی ہاشمی کے غلام کی طرح ہوگا (یعنی اگر ہاشمی کسی کافر غلام کو آزاد کرے تو اس پر جزیہ اور خراج ہوتا ہے اسی طرح تغلبی غلام پر بھی ہوگا ۔ مسلمانوں کا دو چند نہ ہوگا بلکہ جزیہ و خراج واجب ہوگا) ۔

امام زفرؒ نے فرمایا : دو چند لیا جائے گا ، حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ قوم کا غلام بھی انہیں سے ہوتا ہے . کیا آپ کو معلوم نہیں کہ حرمت صدقہ کے لحاظ سے ہاشمی کے غلام کو بھی اسی کے ساتھ لاحق کیا جاتا ہے ؟

ہماری دلیل یہ ہے کہ یہ دو چند لینا تخفیف اور رعایت کی بناء پر ہے اور آزاد کردہ غلام اس تخفیف میں اپنے اصل یعنی آزاد کرنے والے آقا سے لاحق نہ ہوگا . اسی بناء پر مسلمان کے نصرانی غلام پر جزیہ عائد کیا جاتا ہے ، بخلاف حرمت صدقہ کے کیونکہ حرمتوں کا ثبوت شبہات سے ہوتا ہے تو حرمت صدقہ کے سلسلے میں آزاد کردہ غلام کو ہاشمی کے ساتھ لاحق کیا گیا . (اگر سوال کیا جائے کہ غنی کے آزاد کردہ غلام پر بھی صدقہ حرام ہونا چاہیے کیونکہ شبہ تو وہاں بھی موجود ہے ، مصنفؒ جواب میں فرماتے ہیں) : غنی کے غلام کا اعتراض نہیں کیا جا سکتا کیونکہ غنی پر صدقہ حرام نہیں ہوتا . اس کی وجہ یہ ہے کہ غنی آدمی میں صدقہ لینے کی اهلية ہے . البتہ اس کی دولت مندی بالفعل لینے سے مانع ہے مگر غنی کے آزاد کردہ غلام میں تونگری نہیں پائی جاتی اور ہاشمی میں تو صدقہ لینے کی اهلية بالکل معدوم ہوتی ہے (خواہ غریب ہی ہو) کیونکہ وہ شرافت و کرامت کی بناء پر لوگوں کی میل کچیل سے محفوظ رکھا گیا ہے اور اس کا غلام بھی اس کے ساتھ لاحق ہوگا .

مسئلہ : اور امام جو مال خراج ، بنی تغلب کے ادا کردہ اموال ، اهل حرب کے پیش کردہ تحائف اور جزیہ سے اکھٹا کرے اسے مفاد مسلمین کے لیے صرف کرے مثلاً سرحدوں کا مضبوط کرنا ، پل بنانا وغیرہ . مسلمانوں کے قاضی حضرات ، عاملوں اور علماء کرام کو گزارے کے مطابق دے جو ان کی ضروریات کے لیے کافی ہو ، اور اس میں سے مجاهدین اور ان کے اهل و عیال کے اخراجات ادا کیے جائیں کیونکہ یہ بیت المال کا مال ہے جو مسلمانوں کو بغیر قتال کے حاصل ہوا ہے . اور بیت المال کا قیام مسلمانوں کے مفاد کے لیے ہوتا ہے اور مذکورہ بالا حضرات (یعنی قضاۃ و علماء و مجاهدین وغیرہ) مسلمانوں کی خدمت کا فریضہ ہی سر انجام دیتے ہیں . اور اولاد کے اخراجات باپ کی ذمہ داری ہے . اگر ان کو گزارے کے مطابق نہ دیا جائے تو انهیں کوئی نہ کوئی کام کرنا پڑے گا اور وہ جنگ و جهاد کے لیے فارغ نہ ہو سکیں گے .

مسئلہ : اگر ان مذکورہ حضرات میں سے کوئی شخص سال کے نصف میں (یا سال کے آخر میں) مر گیا تو اسے عطاء سے کچھ نہ دیا جائے گا . کیونکہ یہ عطاء صلے کی ایک قسم ہے ، قرض نہیں ہے . اسی لیے اسے عطاء کہا جاتا ہے . اور قبضہ سے پہلے ملکیۃ ثابت نہیں ہوتی . اور موت سے ساقط ہو جاتی ہے (یعنی عطاء) اور ہمارے زمانے میں قضاۃ ، مدرسین اورمفتی حضرات اهل عطاء سے ہیں .

وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ

بَابُ أَحكامِ الْمُرتَدِّينَ

مرتد لوگوں کے احکام

مسئلہ : خدا نخواستہ اگر مسلمان اسلام سے ارتداد اختیار کرے تو اس پر اسلام پیش کیا جائے گا اور اگر اسے کوئی شک و شبہ ہو تو اسے دور کرنے کی کوشش کی جائے گی . کیونکہ ممکن ہے اسے اسلام کے بارے میں کوئی شبہ پیش آگیا ہو تو وہ دور کیا جائے گا . اور اس کا شر دور کرنے کے دو طریقوں (یعنی اسلام یا قتل) میں سے یہ عمدہ طریقہ ہے (کہ اسے اسلام کے بارے میں پیدا شدہ شبہات کا صحیح حل بتایا جائے اور اسلام کی حقانیة اس پر واضح کی جائے) . مشایخ کا کہنا ہے کہ اس پر اسلام پیش کرنا واجب نہیں ہے کیونکہ ایک بار اسے دعوۃ اسلام پہنچ چکی ہے .

مسئلہ : امام قدوری رحمہ اللہ نے فرمایا : اسے تین دن تک محبوس رکھا جائے . اگر اسلام قبول کرلے (تو بہت اچھا ہے) ورنہ اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا .

الجامع الصغیر میں مذکور ہے کہ مرتد آزاد ہو یا غلام اس پر اسلام پیش کیا جائے گا . اگر قبول اسلام سے

انکار کرے تو قتل کر دیا جائے گا۔ امام قدوریؒ کے قول "کہ اسے تین دن محبوس رکھا جائے" کی تأویل یہ ہے کہ اگر مرتد مہلة کی استدعا کرے تو اسے تین دن کی مہلة دی جائے گی، کیونکہ یہی مدت ہر قسم کے عذروں کے لیے مقرر ہے۔

امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کا ارشاد ہے: مستحسن صورت یہ ہے کہ وہ مہلة طلب کرے یا نہ کرے اسے تین دن کی مہلة دی جائے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں: امام پر واجب ہے کہ وہ مرتد کو تین دن کی مہلة دے اور اس مدة سے پہلے قتل کرنا جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ مسلمان کا اسلام سے ارتداد اختیار کرنا بظاہر کسی شبہے کی بناء پر ہوتا ہے، لہذا اسے سوچ بچار کے لیے کچھ وقت کی ضرورة ہے۔ اور ہم نے یہ مدت تین دن مقرر کی۔

ہماری دلیل اللہ تعالی کا یہ ارشاد ہے: فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ التوبہ: ۵ (یعنی مشرکین کو قتل کر دو)۔ اور اس میں مہلة دینے کی کوئی شرط نہیں۔ نیز نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص دین اسلام کو تبدیل کرے اسے قتل کر دو۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ مرتد ہو جانے کی بناء پر حربی کافر ہوگیا جس کو دعوة اسلام پہنچ چکی ہے، تو بغیر مہلت دیے اس کو اسی وقت قتل کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس

کا دوبارہ اسلام لانا امر موہوم ہے، اور امر موہوم کے مدنظر واجب امر میں تاخیر جائز نہیں ہوتی ۔ اور دلائل کے مطلق ہونے کی بناء پر آزاد اور غلام میں کوئی فرق نہ ہوگا ۔

مرتد کے توبہ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ کلمۂ شہادتین کی ادائیگی کے بعد اسلام کے سوا باقی تمام مذاہب سے بیزاری کا اعلان کرے ، کیونکہ اس کا کوئی دین نہیں رہا ۔ دین اسلام کو چھوڑنے کے بعد اس نے جو دین اختیار کیا ہے اگر اس سے بیزاری کا اعلان کر دے تو کافی ہوگا ، کیونکہ اس اعلان سے بھی مقصد حاصل ہو جاتا ہے ۔

مسئلہ : امام قدوری[رح] نے فرمایا : اگر اسلام پیش کرنے سے پہلے اسے کوئی شخص قتل کر دے تو مکروہ ہوگا ۔ البتہ قاتل پر (قصاص یا دیۃ) کچھ بھی واجب نہ ہوگا ۔ کراھۃ سے مراد ترک استحباب ہے ۔ اور ضمان اس لیے واجب نہیں کہ کفر قتل کو مباح کر دیتا ہے اور دعوۃ کے پہنچ جانے کے بعد اسلام کا پیش کرنا واجب نہیں ہوتا ۔

مسئلہ : مرتدہ عورت کو قتل نہیں کیا جائے گا ۔ امام شافعی[رح] فرماتے ہیں : کہ قتل کر دی جائے گی جیسا کہ ہم روایۃ کر چکے ہیں (کہ جو بھی دین تبدیل کرے اسے قتل کر دو ۔ اس حدیث میں مرد یا عورت کی کوئی تخصیص نہیں)۔ دوسری بات یہ ہے کہ مرد کا ارتداد اس کے قتل کو مباح کرنے کا سبب ہے ۔ کیونکہ ارتداد بہت بڑا جرم ہے اور اس کی سزا بھی سزائے شدید (یعنی قتل ہوگی) ۔

اور عورت کا ارتداد بھی اسی جنایۃ شدیدہ میں شریک ہوتا ہے لہذا حکم میں بھی مشارکۃ ہوگی ۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے عورتوں کے قتل سے منع فرمایا ہے ۔ دوسری بات یہ ہے کہ جزاؤں میں اصل یہ ہے کہ انہیں دارالآخرۃ تک مؤخر کیا جائے ۔ کیونکہ فوری طور پر سزا دینے میں ابتلاء و امتحان کے معنے میں خلل آ جاتا ہے (اور یہ دنیا دارالامتحان ہے دارالجزاء نہیں ہے) ۔ اور مرتد کی صورت میں اس اصل سے عدول اس لیے کیا گیا کہ اس کی شرارۃ کا ازالہ کیا جا سکے ۔ یعنی لڑائی کو روکا جا سکے ۔ لیکن عورتوں سے جنگ کا خدشہ نہیں ہوتا ۔ کیونکہ وہ اپنی فطرۃ کے لحاظ سے صلاحیۃ جنگ سے محروم ہوتی ہیں ، بخلاف مردوں کے ۔ پس مرتدہ کافرہ اصلی کافرہ عورت کی طرح ہوگی ۔ (اور جو عورت ابتداءً ہی کافرہ ہو اسے قتل نہیں کیا جاتا ، لہذا مرتدہ کو بھی قتل نہیں کیا جائے گا) ۔

لیکن مرتدہ کو اس وقت تک قید میں رکھا جائے گا جب تک کہ وہ اسلام نہ لے آئے ، کیونکہ اس نے اللہ تعالی کے حق کا اقرار کرنے کے بعد اس کے ایفاء سے انکار کیا ہے ، تو قید کر کے اسے ایفاءِ حق پر مجبور کیا جائے گا ۔ جیسا کہ حقوق العباد میں (انسان کو مجبور کرکے بھی ایفاء کرایا جاتا ہے) ۔

الجامع الصغیر میں مذکور ہے کہ عورت کو خواہ

آزاد ہو یا لونڈی اسلام لانے پر مجبور کیا جائے گا۔ اور لونڈی کو اس کا آقا مجبور کرے گا۔ مجبور کرنے کی وجہ ابھی ہم سطور بالا میں ذکر کر چکے ہیں۔ اور آقا کو مجبور کرنے کا حق اس لیے دیا گیا کہ اس بناء پر دو حق جمع ہو جائیں (یعنی حق الٰہی اور حق آقا)۔ اور روایۃ کیا گیا ہے کہ اسے ہر روز مارا جائے تاکہ اسے اسلام لانے پر پورے طور پر مجبور کر دیا جائے۔

مسئلہ: امام قدوریؒ نے فرمایا: مرتد کے ارتداد کی بناء پر اس کا حق اس کے اموال سے زائل ہو جاتا ہے۔ مگر یہ زوال موقوف ہوگا، اگر دوبارہ اسلام لے آئے تو اس کی ملکیۃ بھی بحال ہو جائے گی۔ مشایخ نے کہا کہ یہ امام ابو حنیفہؒ کی رائے ہے اور صاحبینؒ کا کہنا ہے کہ اس کی ملک زائل نہ ہوگی، کیونکہ وہ مکلف محتاج ہے تو اس کے قتل ہونے تک اس کی ملک باقی رہے گی۔ جیسے کہ وہ شخص جس کے خلاف رجم یا قصاص کا حکم صادر ہو چکا ہو (اور ان کا خون مباح ہو جانے کے باوجود ان کی ملک زائل نہیں ہوتی)۔

امام ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ وہ ارتداد کی وجہ سے حربی بن چکا ہے اور ہمارے ہاتھوں میں مغلوب و مقہور ہے۔ تاکہ اسے قتل کر دیا جائے۔ اور قتل لڑائی کے بغیر نہیں ہوتا (اور وہ چونکہ حربی بن چکا ہے لہذا اس کا قتل جائز ہے)۔ پس اس امر کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی ملک اور

مالکیت زائل ہو جائے۔ البتہ اتنی بات ہے کہ اس پر جبر کرکے اسے اسلام کی دعوت دی جا رہی ہے اور اسلام کی طرف اس کی واپسی کی توقع بھی ہے۔ پس ہم نے اس کی ملکیت کے زوال کے بارے میں توقف سے کام لیا۔ اگر اسلام قبول کرلے تو عارضۂ ارتداد کے بارے میں یہی خیال کریں گے گویا یہ ملکیۃ کے حق میں وقوع پذیر ہوا ہی نہیں۔ اور اب صورۃ یہ ہوگی کہ گویا وہ برابر مسلمان رہا اور ملکیۃ کے زوال کا سبب یعنی ارتداد ظہور پذیر ہی نہیں ہوا۔

اگر وہ مر جائے یا حالت ارتداد میں قتل کر دیا جائے یا دارالحرب سے لاحق ہو جائے اور قاضی نے اس کے دارالحرب کے ساتھ لاحق ہونے کا فیصلہ کر دیا، تو اس کا کفر پختہ ہوگیا تو سبب یعنی ارتداد اپنا عمل کرے گا اور اس کی ملکیۃ زائل ہو جائے گی۔

مسئلہ : امام قدوری نے فرمایا : کہ اگر مرتد مر گیا یا ارتداد کی بناء پر قتل کر دیا گیا، تو اس نے جو کچھ بحالت اسلام کمایا تھا وہ اس کے مسلمان ورثاء کو ملے گا اور جو کچھ حالت ارتداد میں کمایا تھا وہ مال غنیمۃ ہوگا۔ یہ امام ابو حنیفہ کا قول ہے۔

امام ابو یوسف اور امام محمد فرماتے ہیں : دونوں قسم کی کمائی ورثاء کی ہوگی۔ اور امام شافعی کی رائے میں دونوں قسم کی کمائی مال غنیمۃ ہوگی۔ کیونکہ وہ کفر کی حالت میں مرا ہے اور مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوا کرتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ وہ ایسے حربی کا مال ہے جسے امان حاصل نہیں ہے پس مال غنیمۃ ہوگا .

صاحبین" کی دلیل یہ ہے کہ دونوں قسم کی کمائی میں اس کی ملکیۃ ارتداد کے بعد بھی باقی ہے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں . لہذا اس کی موت سے یہ ملکیۃ ورثاء کی طرف منتقل ہو جائے گی . (صاحبین" پر اعتراض کیا گیا کہ اس صورۃ سے تو توریث المسلم من الکافر لازم آتی ہے اور یہ ممنوع ہے کہ مسلمان کافر کا وارث بنے ، تو اس سوال کے جواب میں کہا گیا کہ) یہ ملکیۃ ارتداد سے کچھ پہلے وقت کی طرف مستند ہوگی . کیونکہ مرتد ہونا اس کی موت کا سبب ہے تو مسلمان کا مسلمان ہی سے میراث پانا ہوا . (البتہ اس صورۃ میں ایک نقص باقی رہ جاتا ہے کہ اسلام کی حالت میں کمائی تو توریث المسلم من المسلم ہوئی . لیکن جو کچھ اس نے مرتد ہونے کے بعد کمایا ہے اسے ارتداد کے پہلے وقت کی طرف کیسے مستند کیا جا سکتا ہے) .

امام ابو حنیفہ" فرماتے ہیں : کہ اسلام کی حالت میں کمائی کو اسلام کی طرف مستند کرنا تو ممکن ہے کیونکہ ارتداد سے پہلے وہ کمائی موجود تھی . لیکن ارتداد کی حالت میں کمائی کو اسلام کی طرف مستند کرنا ممکن نہیں کیونکہ مرتد ہونے سے پہلے وہ موجود نہ تھی اور مستند ہونے کے لیے یہ شرط ہے کہ اس وقت موجود ہو .

اب رہا یہ معاملہ کہ اس کا وارث کون ہوگا تو امام

ابو حنیفہؒ سے امام حسنؒ نے ایک روایت بیان کی ہے کہ جو شخص مرتد ہونے کی حالت میں اس کا وارث تھا اور مرتد کی موت تک برابر اس کا وارث رہا ، وہی وارث ہوگا کیونکہ وراثة ارتداد سے پہلے کی جانب مستند ہے تو اسی استناد کا اعتبار ہوگا ۔ امام ابو یوسفؒ نے امام ابو حنیفہؒ سے روایت کی ہے، کہ اس کے ارتداد کے وقت جو وارث تھا وہی وارث ہوگا ۔ اگر وہ وارث مر بھی جائے تو اس کے وارث وراثت میں اس کے قائم مقام ہوں گے ۔ کیونکہ ارتداد بمنزلہ موت کے ہے ۔

امام محمدؒ نے امام ابو حنیفہؒ سے یہ روایت کیا ہے کہ مرتد کی موت کے وقت وارث کا اعتبار کیا جائے گا ۔ کیونکہ سبب کے منعقد ہونے کے بعد اور اس کے پورا ہونے سے پہلے جو وارث پیدا ہوگا گویا کہ وہ سبب کے منعقد ہونے سے پہلے پیدا ہونے والا ہے ، اور یہ اس بچے کی طرح ہوگا جو مبیعہ باندی کے ہاں قبضے سے پہلے پیدا ہوا (یعنی جو بچہ باندی کا سودا ہونے کے بعد پیدا ہو لیکن خریدار کے قبضہ کرنے سے پہلے ہو) تو وہ بچہ بیع سے پہلے کا شمار ہوتا ہے ۔ (حاصل یہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ سے اس بارے میں تین روایات ہیں۔ اول روایت حسنؒ کے مطابق دو شرطیں ہیں، پہلی یہ کہ وہ مرتد کے ارتداد کے وقت وارث ہو ، دوسری یہ کہ وہ مرتد کی موت یا قتل کے وقت تک باقی ہو ۔ دوم روایت ابو یوسفؒ کے مطابق صرف اول کا اعتبار ہے ۔ سوم روایت محمدؒ کے مطابق دوسرے وصف کا اعتبار ہے) ۔

جس وقت مرتد مرے یا قتل ہو اگر اس وقت اس کی مسلمہ عورت عدۃ میں ہو تو وہ وارث ہوگی۔ کیونکہ مرتد شوہر کو فرار کرنے والا قرار دیا جائے گا، اگرچہ ارتداد کے وقت صحیح و تندرست ہو۔ (یعنی اگر کوئی مریض مرض موت میں اپنی بیوی کو طلاق بائن دے تو اسے فرار کرنے والا کہا جاتا ہے کہ یہ بے چاری عورت کو جان بوجھ کر وراثت سے محروم کر رہا ہے۔ تو اس صورۃ میں اگر عورت عدۃ گزار رہی ہو اور مریض شوہر کا انتقال ہو جائے تو عورت یقیناً وارث ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر مرتد ارتداد کے وقت مریض ہو اور عورت کی عدۃ ہی میں مر جائے تو عورت بالاتفاق وارث ہوگی اور کتاب میں مذکور صورۃ یہ ہے: مرتد اور ارتداد کے وقت اگرچہ تندرست ہی ہو تو ارتداد سے اسے فرار کرنے والا قرار دیا جائے گا، کیونکہ وہ ارتداد سے اپنی موت کو خود دعوت دے رہا ہے۔ لہذا عورت اگر عدۃ میں ہوئی تو وارث ہوگی، بلکہ امام ابو یوسفؒ نے تو امام ابو حنیفہؒ سے یہ روایت کی ہے کہ عورت چونکہ ارتداد کے وقت وارث تھی لہذا عدۃ گزرنے کے بعد بھی وارث ہوگی)۔

مرتدہ عورت کی کمائی کے حق دار اس کے وارث ہوں گے، کیونکہ اس کی طرف سے جنگ کا امکان نہیں (لہذا وہ قتل نہ کی جائے گی)۔ اور کوئی ایسا سبب نہیں پایا جاتا جس کی وجہ سے اس کا مال غنیمۃ قرار دیا جائے۔ بخلاف مرتد

مرد کے کہ اس کی کمائی امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک غنیمة شمار ہوتی ہے۔

اگر عورت مرض کی حالت میں ارتداد اختیار کرے تو اس کا مسلمان خاوند وارث ہوگا، کیونکہ وہ ارتداد سے خاوند کا حق باطل کرنا چاہتی تھی۔ اگر وہ ارتداد کے وقت تندرست ہو تو خاوند وارث نہ ہوگا کیونکہ اسے قتل نہیں کیا جاتا، تو اس کے ارتداد سے اس کے مال کے ساتھ شوہر کا حق متعلق نہیں ہوتا بخلاف مرتد مرد کے (کہ اسے چونکہ قتل ہونا ہوتا ہے اس لیے اس کے مال کے ساتھ ورثاء کا حق متعلق ہو جاتا ہے)۔

مسئلہ: اگر مرتد ہو کر دارالحرب کے ساتھ لاحق ہوگیا اور حاکم نے اس کے لاحق ہونے کا فیصلہ کر دیا۔ تو اس کے مدبر غلام اور ام ولد باندیاں آزاد ہو جائیں گی، اور اس پر جو قرض تھے وہ واجب الاداء ہوگئے، اور جو کمائی اس نے اسلام کی حالت میں کی تھی وہ وارثوں کی طرف منتقل ہوگئی۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں: اس کا مال موقوف رہے گا۔ جیسا کہ پہلے تھا کیونکہ یہ غائب ہونا گویا کہ سفر میں غائب ہونا ہے جیسا کہ دارالاسلام میں سفر کرتے ہوئے کچھ عرصہ کے لیے غائب ہو جاتا ہے۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ اہل حرب کے ساتھ لاحق ہونے سے ارتداد واضح ہوگیا، اور احکام اسلام کے حق میں وہ مردہ

ہے۔ (قرآن کریم نے کفار کو مردہ قرار دیا ہے) کیونکہ ان پر کوئی بات لازم کرنے کی ولایۃ منقطع ہوگئی، جیسا کہ یہ ولایت مردوں کے حق میں منقطع ہو جاتی ہے۔ تو یہ ارتداد بھی موت ہی کی ایک صورۃ ہوگی۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ قضاءِ قاضی کے بعد اس کا لاحق ہونا متحقق ہوگا، کیونکہ اس کے واپس آنے کا احتمال باقی رہتا ہے۔ لہذا قضاءِ قاضی کا ہونا ضروری ہے۔ تو جب قضاءِ قاضی کی بناء پر اس کی موت حکماً ثابت ہوگئی تو موت کے متعلقہ احکام بھی ثابت ہو جائیں گے اور یہ احکام وہی ہیں جو ہم نے ذکر کیے ہیں جیسا کہ حقیقی موت کی صورۃ میں ہوتا ہے۔

امام محمدؒ کے نزدیک وارث ہونا مرتد کے دارالحرب کے ساتھ لاحق ہونے کے وقت سے ہوگا۔ کیونکہ میراث کا سبب یہی لاحق ہونا ہے اور حکم قاضی تو اس لاحق ہونے کو پختہ کرتا ہے۔ تاکہ اس کی مراجعت کا احتمال منقطع ہو جائے۔

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں: وارث کا اعتبار حکم قاضی کے وقت ہوگا۔ کیونکہ قضاءِ قاضی سے وہ حکماً مردہ قرار دیا جاتا ہے۔

اور مرتدہ عورت جب دارالحرب کے ساتھ لاحق ہو جائے تو اس کے بارے میں بھی یہی اختلاف ہے۔

مسئلہ: اور وہ قرضے جو مرتد پر حالت اسلام میں تھے، وہ اس کی بحالت اسلام کی کمائی سے ادا کیے جائیں گے؛

اور جو قرضے ردۃ کی حالت میں اس کے ذمہ تھے وہ بحالت ارتداد کی کمائی سے ادا ہوں گے۔ مصنفؒ فرماتے ہیں کہ یہ امام ابو حنیفہؒ کی رائے ہے۔ امام حسنؒ نے امام ابو حنیفہؒ سے روایت کیا ہے کہ قرضوں کی ادائیگی کی بحالت اسلام کی کمائی سے ابتداء کی جائے گی۔ اگر اس مال سے ادائیگی مکمل نہ ہو سکے تو حالت ردۃ کی کمائی سے پورے کیے جائیں گے۔

امام ابو یوسفؒ نے امام ابو حنیفہؒ سے اس کے برعکس روایت کیا ہے (یعنی ابتداء حالت ردۃ کی کمائی سے کی جائے گی اور اگر قرضے مکمل نہ ہوں تو حالت اسلام کی کمائی سے پورے کیے جائیں گے)۔

پہلی روایت کی وجہ یہ ہے کہ جو شے واجب الاداء ہے وہ دو مختلف سببوں کی وجہ سے مختلف ہے (کہ اسلامی کمائی سے اس پر اسلامی قرضہ واجب الاداء ہے اور ردۃ کی کمائی سے ارتداد کا قرضہ)، تو دو مختلف سببوں سے دو طرح کا قرضہ اس پر واجب ہے۔ اور اسلام کی کمائی دونوں میں سے ہر ایک اس ایسے سبب کے اعتبار سے حاصل ہوئی جس کی وجہ سے قرض واجب ہوا (یعنی بحالت اسلام اس نے قرض لے کر تجارۃ کی اور اسی طرح بحالت ردۃ قرض لے کر مثلاً شراب وغیرہ کی تجارت شروع کر دی تو دونوں کمائیاں الگ الگ قرض سے حاصل ہوئیں)۔ پس ہر ایک قرضہ اسی کمائی سے ادا کیا جائے گا جو قرضہ لینے کے وقت اس کی

حالت کی کمائی تھی تا کہ قرض کی ادائیگی منفعة کے مطابق ہو ۔

دوسری روایة کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کی کمائی اس کی ملکیة ہوتی ہے حتی کہ اس کا وارث (اس کی موت کی صورة میں) اس کا قائم مقام ہوتا ہے ، اور اس کے قائم مقام ہونے کی شرط یہ ہے کہ مورث دوسرے حقوق سے فارغ ہو (یعنی مرنے والے پر کسی دوسرے کا کچھ قرض وغیرہ نہ ہو) لہذا وراثة پر قرض کو مقدم کیا جاتا ہے ۔

بحالت ارتداد کی کمائی کا اسے مالک قرار نہیں دیا جاتا ۔ کیونکہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ارتداد سے اس کی اھلیة ملکیة باطل ہو جاتی ہے ، تو اس کمائی سے اس کا قرض ادا نہیں کیا جائے گا ۔ البتہ اگر اسلامی کمائی سے اس کے قرض کی ادائیگی مشکل ہو تو اس وقت ردة کی کمائی کی طرف رجوع کیا جائے گا ۔ جیسا کہ ذمی اگر مر جائے اور اس کا کوئی وارث نہ ہو تو اس کا مال جماعة المسلمین کے لیے ہوتا ہے ، اور اگر اس پر قرض ہو تو قرض اسی مال سے ادا کیا جاتا ہے ۔ اسی طرح یہاں بھی ہوگا ۔

تیسری روایة کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کی کمائی تو وارثوں کا حق ہے اور ردة کی کمائی خالصةً اس کا اپنا حق تھی ۔ لہذا قرض اس کے اپنے حق سے ادا کرنا اولی ہوگا ۔ البتہ اگر وہ مال قرض کی ادائیگی کے لیے ناکافی نہ ہوا تو اس کے حق کو مقدم رکھتے ہوئے کسب اسلام سے قرضوں کی ادائیگی مکمل کی جائے گی ۔

امام ابو یوسف اور امام محمد فرماتے ہیں: دونوں کمائیوں سے اس کے قرض ادا کیے جائیں گے، کیونکہ دونوں اس کی ملک تھیں حتی کہ وراثۃ بھی دونوں کمائیوں میں جاری ہوتی ہے۔ (ائمہ ثلاثۃ کی بھی یہی رائے ہے)۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ ۝

مسئلہ: امام قدوری نے فرمایا: مرتد نے ردۃ کی حالت میں جو مال فروخت کیا یا خرید کیا، یا آزاد کیا یا ھبہ کیا یا رہن رکھا یا اپنے مال میں جو بھی تصرفات کیے وہ موقوف ہوں گے۔ اگر وہ دوبارہ اسلام لے آیا تو اس کے سب تصرفات صحیح ہوں گے۔ لیکن اگر مرگیا یا قتل ہوگیا یا دارالحرب سے لاحق ہوگیا تو باطل ہوگئے۔ یہ امام ابو حنیفہ کی رائے ہے، امام ابو یوسف اور امام محمد فرماتے ہیں: دونوں حالتوں میں اس کے کیے ہوئے تصرفات جائز ہوں گے۔

جاننا چاہیے کہ مرتد کے تصرفات کے کئی اقسام ہیں:
اول۔ جو تصرفات کہ بالاتفاق نافذ ہیں جیسے ام ولد بنانا اور طلاق دینا (طلاق کی صورۃ یہ ہے کہ دونوں اکھٹے مرتد ہو جائیں اور زوجہ کو طلاق دے دے) کیونکہ ایسے تصرف میں حقیقی ملک اور پوری ولایۃ کا ہونا ضروری نہیں۔

دوم وہ تصرفات جو بالاتفاق باطل ہوتے ہیں جیسا کہ نکاح اور ذبیحہ کیونکہ یہ تصرف ملۃ و مذہب کی بناء پر

ہوتا ہے اور اس کی کوئی ملة نہیں ۔

سوم وہ تصرفات جو بالاتفاق موقوف ہیں جیسے شرکة مفاوضہ، کیونکہ اس کا مدار مساواۃ پر ہوتا ہے؛ اور مسلمان اور مرتد کے درمیان کوئی مساواۃ نہیں جب تک کہ مرتد اسلام نہ لائے ۔

چہارم وہ تصرفات جن کے توقف میں اختلاف ہے اور یہ وہی امور ہیں جو متن میں مذکور ہیں یعنی بیع ، شراء ، ہبہ وغیرہ ۔ صاحبینؒ کی دلیل یہ ہے کہ تصرف کی صحت کا مدار اہلیة پر ہے اور نفاذ کا مدار ملکیة پر ہے اور اس کی اہلیة کے بارے میں کوئی شبہ نہیں ۔ کیونکہ وہ احکام شرع کا مخاطب ہے اور اسی طرح مرتد کی ملکیة بھی اس کی موت تک قائم ہوتی ہے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں ۔ اسی بناء پر اگر اس کے ارتداد کے بعد چھ ماہ تک اس کی مسلمان بیوی سے کوئی بچہ پیدا ہو تو وہ وارث ہوگا ۔ (اگر ملکیة موجود نہ ہوتی تو بچہ کیسے وارث ہوتا) ۔ اور اگر ارتداد کے بعد مرتد کی موت سے پہلے یہ بچہ مر جائے تو وارث نہ ہوگا ۔ پس موت سے پہلے اس کے تصرفات صحیح ہوں گے ۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک یہ تصرفات اسی طرح صحیح ہوں گے جس طرح تندرست آدمی کے تصرفات صحیح ہوتے ہیں ۔ کیونکہ یہ احتمال واضح ہے کہ وہ شاید اسلام کی طرف لوٹ آئے ، اس کے شکوک زائل ہو جائیں اور قتل ہونے سے بچ جائے ، تو یہ مرتدہ عورت کی طرح ہوگا (جسے قتل نہیں کیا جاتا) ۔

امام محمد کے نزدیک یہ تصرفات اسی طرح صحیح ہوں گے جس طرح مریض کے تصرفات ہوتے ہیں (یعنی اسے اپنے مال کی ایک تہائی میں تصرفات کا اختیار ہوگا)، کیونکہ جو شخص کسی ایسے دعوے پر ثابت ہوا۔ خصوصاً ایسی حالة میں کہ جس میں پیدا ہوا ہے (یعنی بحالت اسلام) اور جس حالة میں نشو و نما پائی ہے، پھر اس سے روگردان ہوگیا تو شاذ و نادر ہی ایسا ترک کرنا پیش آتا ہے۔ (یعنی ارتداد قلیل الوقوع ہے) تو بظاہر اس کا انجام قتل ہی نظر آتا ہے۔ بخلاف مرتدہ عورت کے کہ وہ قتل نہیں کی جاتی۔

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں: وہ شخص حربی بن چکا ہے اور ہمارے ہاتھوں میں مقہور و مغلوب ہے جیسا کہ ہم توقف ملک کے سلسلے میں بتا چکے ہیں اور توقف ملک کی وجہ سے اس کے تصرفات بھی موقوف ہوں گے۔ اور یہ مرتد اس حربی کی طرح ہوگا جو ہمارے ملک میں امان لیے بغیر داخل ہوتا ہے اسے گرفتار کر لیا جاتا ہے اور مقہور و مغلوب بنا لیا جاتا ہے، تو اس کے تصرفات موقوف ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اس کی حالت میں توقف ہوتا ہے (کہ اس کے بارے میں غلام بنانے یا قتل کرنے یا احسان کے ساتھ چھوڑ دینے میں سے کیا مفید ہوتا ہے)، اسی طرح مرتد کے بارے میں بھی توقف ہوگا۔

اور اس کا مستحق قتل ہونا اس بناء پر ہے کیونکہ اس کی عصمة و احترام باطل ہوگیا ہے تو دونوں صورتوں

میں (یعنی حربی کی صورۃ ہو یا مرتد کی) اھلیۃ میں خلل پایا گیا، بخلاف اس شخص کے جو زناء کرتا ہے یا عمداً قتل کرتا ہے تو ان صورتوں میں استحقاق یہ ہے کہ انہیں جرم کی سزا دی جائے، اور بخلاف مرتدہ عورت کے کہ وہ حربی نہیں ہوتی لہذا اسے قتل نہیں کیا جاتا۔

مسئلہ: جب قاضی کسی مرتد کے دارالحرب کے ساتھ لاحق ہونے کا فیصلہ صادر کر دے اور مرتد لاحق ہونے کے بعد پھر دارالاسلام میں آ جائے تو اس کے وارثوں کے پاس اس کا جو مال بعینہ موجود ہے وہ واپس لے سکتا ہے۔ کیونکہ وارث اس کے قائم مقام اس وجہ سے ہوئے تھے کہ وہ مرتد ہونے کی بناء پر اس مال سے بے پروا ہوگیا تھا۔ لیکن جب وہ دوبارہ مسلمان ہو کر لوٹ آیا تو اسے مال کی احتیاج ہوگی اور اس کا حق مقدم ہوگا۔ ہاں اگر وارث اس مال کو اپنی ملکیۃ سے زائل کر چکا ہو (تو اس پر ضمان نہ ہوگی) نیز ام ولد باندیاں اور مدبر غلام بھی غلامی میں واپس نہ آئیں گے۔ کیونکہ ایک صحیح دلیل کی بناء پر قاضی کا فیصلہ صحیح تھا اب اس فیصلے کو توڑا نہ جائے گا۔

اگر قضاءِ قاضی سے پہلے مسلمان ہو کر آ جائے تو اسے برابر مسلمان تصور کیا جائے گا جیسا کہ ہم ذکر کرچکے ہیں۔

مسئلہ: اگر مرتد نے ایسی نصرانی لونڈی سے مباشرۃ کی جو بحالت اسلام اس کی مملوکہ تھی اور ارتداد کی مدت کے چھ ماہ کے بعد زائد عرصے میں باندی کے ہاں لڑکا پیدا

ہوا اور مرتد نے اس کے نسب کا دعوی بھی کرلیا تو یہ باندی ام ولد ہوگی ، بچہ آزاد ہوگا . وہ اسی کا بیٹا ہوگا مگر باپ کی جائداد کا وارث نہ ہوگا . اگر لونڈی مسلمہ ہو اور مرتد اپنی ردة میں ہی مر جائے یا دارالحرب سے لاحق ہو جائے تو بچہ وارث ہوگا .

ام ولد کے صحیح ہونے کی وجہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ، اور وراثة کی صورة یہ ہے کہ ماں جب نصرانیہ تھی تو بیٹا باپ کے تابع ہوگا . کیونکہ وہ اسلام کے زیادہ قریب ہے کیونکہ اسے اسلام لانے پر مجبور کیا جائے گا . تو بچہ (فی الحال) مرتد کے حکم میں ہوگا (اور اسی کے تابع ہوگا) اور مرتد مرتد کا وارث نہیں ہوا کرتا . لیکن جب باندی مسلمان ہو تو بچہ اس کے تابع قرار دیا جائے گا ، کیونکہ وہ دینی لحاظ سے بہتر حالت میں ہے . اور مسلمان مرتد کا وارث ہوا کرتا ہے .

مسئلہ : اگر مرتد اپنے مال سمیت دارالحرب سے لاحق ہو جائے پھر اس مال پر غلبہ حاصل کر لیا جائے تو یہ مال غنیمة ہوگا . اگر ایک دفعہ دارالحرب سے لاحق ہوجائے پھر لوٹ کر آئے اور مال لے جائے اور دارالحرب سے لاحق ہو جائے اور مال پر غلبہ حاصل ہو جائے اور وارث تقسیم سے پہلے حاصل کرلیں تو یہ مال انہیں کو دے دیا جائے گا . کیونکہ پہلی صورة میں مال وراثت کا اجراء نہیں ہوا تھا اور دوسری صورة میں مال قاضی کے لاحق ہونے کا

فیصلہ کرنے سے وارثوں کی طرف منتقل ہو چکا تھا اور وارث مالک قدیم ہوگا (اور مالک قدیم کو اگر تقسیم سے پہلے اپنا مال مل جائے تو وہ حق دار ہوتا ہے) .

مسئلہ : اگر مرتد دارالحرب سے لاحق ہوگیا اور دارالاسلام میں اس کا غلام تھا ؛ اس کا فیصلہ بیٹے کے حق میں کر دیا گیا اور بیٹے نے اسے مکاتب بنا دیا . پھر مرتد مسلمان ہوکر آگیا تو غلام کی مکاتبة جائز ہوگی اور غلام کی مکاتبة اور ولاء کا حق دار وہ مرتد ہوگا جو مسلمان ہوکر آگیا ہے ، کیونکہ اب کتابة کو باطل کرنے کی کوئی صورة نہیں جب کہ دلیل صحیح کے تحت اس کا نفاذ ہو چکا ہے . اور اس کے وارث کو جو اس کے قائم مقام تھا اس کی طرف سے وکیل تصور کیا جائے گا اور عقد کتابة کے حقوق مؤکل کی طرف راجع ہوں گے (یعنی باپ کی طرف) . اور ولاء اس شخص کا حق ہوتا ہے جو غلام کو آزاد کرے .

مسئلہ : اگر مرتد نے کسی شخص کو خطاء سے قتل کر دیا ؛ پھر دارالحرب سے لاحق ہوگیا یا ردة کی حالت میں قتل کر دیا گیا تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک خصوصاً اس مال سے دیة ادا کی جائے گی جو اس نے بحالت اسلام کمایا تھا .

صاحبینؒ کہتے ہیں کہ دونوں مالوں میں سے جو اس نے بحالت اسلام کمایا ہے یا بحالت ردة دیة دی جائے گی . مرتد کی برادری اس مالی بار کو برداشت نہیں کرے گی

کیونکہ نصرۃ معدوم ہو چکی ہے۔ لہذا دیۃ اس کے مال سے ادا کی جائے گی اور صاحبینؒ کے نزدیک اس کی دونوں قسم کی کمائی اس کا مال ہیں ؛ کیونکہ دو حالتوں میں اس کے تصرفات مالیہ کا نفاذ ہوتا ہے۔اسی بناء پر صاحبینؒ کے نزدیک دونوں مالوں میں وراثۃ جاری ہوتی ہے۔

امام اعظمؒ کے نزدیک بحالۃ اسلام کمائی سے دیۃادا ہوگی کیونکہ اس کا تصرف بھی اسی کمائی میں نافذ ہوتا ہے ؛ حالت ردۃ کی کمائی میں نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس حالت میں اس کا تصرف موقوف رہتا ہے۔ اسی بناء پر امام کے نزدیک کسب اسلام میں وراثۃ جاری ہوگی اور کسب ردۃ مال غنیمۃ ہوگا۔

مسئلہ : اگر کسی مسلمان کا ھاتھ عمداً کاٹا گیا اور وہ نعوذ باللہ مرتد ہوگیا اور حالت ارتداد میں اسی زخم سے مرگیا یا دارالحرب سے لاحق ہوگیا اور پھر مسلمان ہوکر واپس آیا اور اسی زخم سے مرگیا تو ھاتھ کاٹنے والے پر واجب ہوگا کہ وہ اپنے مال سے نصف دیۃ اس کے وارثوں کو دے۔ پہلی صورۃ میں (جب کہ حالت ارتداد میں مرجائے) وجہ یہ ہے کہ قطع ید نے اس میں سرایۃ کی۔ مگر اس سرایۃ کا تعلق ایسے محل سے ہے جو محترم نہیں رہا پس خون ضائع گیا۔ بخلاف اس کے اگر مرتد کا ہاتھ کاٹا گیا اور وہ اسلام لے آیا اور اسی زخم سے مرگیا (تو بھی کچھ واجب نہ ہوگا) کیونکہ قطع ید کے وقت ارتداد کی بناء پر اس کا

خون هدر تھا تو قطع ید کے بعد اسلام لانے کا دیة کے بارے میں اعتبار نہ ہوگا . اور جو قصاص پہلے سے قابل اعتبار ہو وہ بھی گاہے گاہے ھدر ہو جاتا ہے مثلاً معافی دے دی جائے ، پس اسی طرح ردة کی بناء پر بھی ھدر ہوگا .

دوسری صورة میں یعنی جب دارالحرب سے لاحق ہوگیا اس کا مطلب یہ ہے کہ جب اس کے لاحق ہونے کا فیصلہ کر دیا گیا ، کیونکہ حکماً مر چکا ہے اور موت سے زخم کی سرایة منقطع ہو جاتی ہے اور دوبارہ اسلام لانا گویا حکماً دوسری اور نئی زندگی ہے ، تو پہلے جرم کی سزا عود نہیں کرے گی .

اگر قاضی اس کے لاحق ہونے کا فیصلہ نہ کرے تو اس صورة میں اختلاف ہے جس کی تفصیل ہم إن شاء الله آیندہ سطور میں بیان کریں گے . اگر دارالحرب سے لاحق نہ ہو اور اسلام لے آنے کے بعد اس زخم سے مر جائے تو قاطع پر کامل دیة ہوگی . یہ امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کی رائے ہے . امام محمدؒ اور امام زفرؒ کہتے ہیں کہ مذکورہ بالا تمام صورتوں میں نصف دیة ہوگی . کیونکہ درمیان میں ردة طاری ہونے سے سرایة باطل ہوگئی ؛ تو دوبارہ اسلام لانے سے ضمان عود نہ کرے گی جیسا کہ کسی مرتد کا ہاتھ کاٹا جائے اور وہ اسلام لاکر زخم سے مر جائے .

امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں : جنایة محل محترم میں وارد ہوئی اور پوری بھی اسی حالت میں

ہوئی تو ضمان نفس دیۃ کاملہ کے طور پر واجب ہوگی ؛ جیسا کہ درمیان میں ردۃ طاری ہی نہ ہو (تو ضمان کامل واجب ہوتی ہے) . اس کی وجہ یہ ہے کہ جنایۃ کی بقاء کی صورۃ میں عصمۃ و احترام کے قیام کا اعتبار نہیں کیا جاتا بلکہ اس کا قیام سبب کے انعقاد کے وقت اور حکم کے ثابت ہونے کے وقت ضروری ہوتا ہے . (اور ہاتھ کا کٹنا اور اس کی وجہ سے مرنا دونوں بحالت اسلام ظہور پذیر ہوئے). اور بقاء جرم کی حالت ان سب سے الگ ہے اور یہ ایسے ہوگا جیسے قسم کے باقی رہنے کے زمانے میں ملکیۃ کا قیام ہوتا ہے . (مثلاً اگر زوجہ سے کہا : أنتِ طالقٌ إنْ دَخَلْتِ الدّارَ پھر اسے ایک طلاق بائن دے دی اور چند روز کے بعد اس سے نکاح کر لیا . اگر وہ ممنوعہ گھر میں داخل ہوئی تو اسے طلاق ہو جائے گی ، تو ملک نکاح کا قسم کے انعقاد کے وقت پایا جانا ضروری ہے . اس طرح شرط کے پائے جانے کے وقت ضروری ہے اور درمیانی زمانے میں ملکیۃ کا اعتبار ضروری نہیں ایسا ہی متن میں مذکورہ صورۃ میں ہوگا) .

مسئلہ : اگر مکاتب غلام مرتد ہو کر دارالحرب سے لاحق ہو جائے اور وہاں سے مال کمائے پھر اسے مال سمیت پکڑ لیا جائے لیکن وہ اسلام لانے سے انکار کرے تو اسے قتل کر دیا جائے گا ، تو اس مال سے آقا کو مال مکاتبت ادا کیا جائے گا اور جو باقی رہا وہ مکاتب کے مسلمان ورثاء کا ہوگا . یہ مسئلہ صاحبینؒ کے اصول کے مطابق تو واضح

ہے ، کیونکہ ان کے نزدیک حُر ہو یا مکاتب ہو جو کچھ بھی وہ ردت کی حالت میں کمائے اس کی ملکیة ہوتا ہے .

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس صورة میں اصول یہ ہے کہ مکاتب کتابت کی وجہ سے اپنی کمائی کا مالک ہوتا ہے ، اور کتابت چونکہ ردة سے موقوف نہیں ہوتی اسی طرح اس کی کمائی بھی موقوف نہ ہوگی . کیا آپ دیکھتے نہیں کہ غلام ہونے کی صورة میں بھی اس کا تصرف موقوف نہ تھا؟ تو اس سے ادنی صورة یعنی ردة سے بھی موقوف نہ ہوگا .

مسئلہ : اگر خدا نخواستہ شوہر اور بیوی دونوں مرتد ہوکر دارالحرب سے لاحق ہو جائیں اور عورت دارالحرب میں حاملہ ہو جائے اور بچہ جنے اور پھر جب وہ بڑا ہو اور اس کا بچہ پیدا ہو ، پھر ان سب پر غلبہ حاصل کر لیا جائے تو دونوں بچے یعنی باپ بیٹا مال غنیمة ہوں گے . کیونکہ مرتدہ کو غلام بنا لیا جائے گا اور اس کا بیٹا بھی اس کے تابع ہوگا اور پہلے لڑکے کو اسلام لانے پر مجبور کیا جائے گا اور مرتد کے پوتے کو مجبور نہیں کیا جائے گا .

امام ابو حنیفہؒ سے امام حسن نے روایة کیا ہے کہ دادا کے تابع قرار دیتے ہوئے اسے بھی مجبور کیا جائے گا . اس اختلاف کی اصل وجہ یہ ہے کہ اسلام میں امام حسنؒ کی روایة کے مطابق دادا کی تبعیة کا اعتبار ہوتا ہے اور یہ چار مسئلوں کا چوتھا مسئلہ ہے جن سب میں دو دو روایتیں ہیں ، دوسرا صدقہ فطر کا مسئلہ ہے؛ اور تیسرا ولاء

کا لانا اور چوتھا قرابت کے حق میں وصیت کرنا ہے. (تو چار مسئلے یہ ہوئے کہ کیا پوتا اسلام میں دادا کے تابع ہوگا؟ کیا دادا اپنے بیٹے کے غریب ہونے کی صورۃ میں پوتے کا صدقہ فطر ادا کر سکتا ہے؟ اگر دادا اپنے پوتے کو آزاد کر دے حالیکہ اس کا بیٹا غلام ہی ہو تو کیا اسے حق ولاء حاصل ہوگا اور کیا رشتہ داروں کے حق میں وصیۃ کی صورۃ میں باپ تو داخل نہیں، کیا دادا بھی داخل ہوتا ہے. تو ان صورتوں میں امام حسنؒ کی روایۃ کے مطابق دادے کو باپ کا مقام حاصل نہ ہوگا اور ظاہر الروایۃ کے مطابق دادا بمنزلہ باپ ہوگا).

مسئلہ : امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک عقل مند لڑکے کا ارتداد بھی ارتداد ہی ہے. اسے اسلام لانے پر مجبور کیا جائے گا اور قتل نہ کیا جائے گا اور اس کا مسلمان ہونا صحیح مسلمان ہونا ہوگا. اگر اس کے ماں باپ کافر ہوں گے تو اس کے وارث نہ ہوں گے. امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ اس کا ارتداد ارتداد نہ ہوگا اور اس کا اسلام لانا صحیح اسلام لانا ہوگا.

امام زفرؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں : نہ تو اس کا اسلام اسلام ہوگا اور نہ اس کا ارتداد ارتداد. ان کی دلیل یہ ہے کہ اسلام یعنی مذہب کے مسئلے میں اپنے والدین کے تابع ہوگا. تو اس کا اسلام اصلی نہ ہوگا (کہ وہ تابع بھی ہو اور اصل بھی، اس سے دو منافع امور کے درمیان اجتماع

لازم آتا ہے) ۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر اس پر اسلامی احکام لازم کریں تو اس کے لیے ضرر و نقصان ہے ۔ پس اس میں اہلیة اسلام کا اعتبار نہ ہوگا (اسے نقصان یہ ہے کہ اس طرح وہ والدین کی میراث سے محروم ہو جائے گا اور اسے والدین سے الگ ہونا پڑے گا) ۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ حضرت علی رض بچپن میں مشرف باسلام ہوئے اور نبی اکرم ﷺ نے اس اسلام کو صحیح قرار دیا اور حضرت علی رض کے لیے اس اسلام کا مایہ افتخار ہونا مشہور بات ہے ۔ دوسری بات یہ ہے کہ بچے کا اسلام اس لیے صحیح ہے کہ اس نے اسلام کی حقیقة کو تصدیق قلبی اور اقرار لسانی کے ساتھ قبول کیا ۔ کیونکہ اپنی رضا و رغبة سے اقرار کرنا اعتقاد کی دلیل ہے جیسا کہ اپنے مقام میں معلوم ہے اور حقائق کو رد نہیں کیا جاتا اور جو چیز اس اسلام سے متعلق ہوگی وہ سعادت ابدی اور نجات اخروی کا سبب ہوگی اور یہ بہت بڑی منفعة کا کام ہے اور یہی اسلام کا حکم اصلی ہے اور باقی امور تو اس پر مبنی ہوتے ہیں ۔ لہذا میراث وغیرہ جیسی دنیوی چیزوں کے لحاظ سے تھوڑے بہت نقصان کی کوئی پروا نہ کی جائے گی (کیونکہ اخروی منافع اس سے کہیں اعلی و ارفع ہیں) ۔

لڑکے کا ارتداد صحیح نہ ہونے کے لیے امام زفر رح ، امام ابو یوسف رح اور امام شافعی رح کی دلیل یہ ہے کہ ارتداد تو مضرة محضہ ہے ۔ (اور جو امور باعث مضرة ہوں ان

کا نفاذ لڑکے کی طرف سے نہیں ہوتا جیسے عتاق و طلاق) بخلاف اسلام کے کہ امام ابو یوسفؒ کے اصول کے مطابق اسلام سے تو اعلی و ارفع منافع یعنی نجاۃ اخروی کا تعلق ہوتا ہے جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کی دلیل ارتداد کے صحیح ہونے کے بارے میں یہ ہے کہ ارتداد در حقیقۃ موجود ہے اور حقیقۃ کے تسلیم کیے بغیر چارۂ کار نہیں ہوتا جیسا کہ اسلام کے سلسلے میں بیان کیا گیا ہے۔ البتہ طفل مرتد کو اسلام لانے پر مجبور کیا جائے گا، کیونکہ اس میں اس کا نفع اور خیر خواہی ہے اور قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ قتل کرنا سزا ہے اور سزائیں بچوں پر جاری نہیں ہوا کرتیں، بلکہ وہ تو رحمۃ و شفقۃ کے مستحق ہوتے ہیں۔

یہ تمام اختلاف اس بچے کے بارے میں ہے جو عقل مند ہو اور جس بچے میں عقل نہ ہو اس کا ارتداد صحیح نہ ہوگا۔ کیونکہ اس کا اقرار تغیر عقیدہ پر دلالت نہیں کرتا، (اسے تو نیک و بد کے درمیان تمیز ہی نہیں)۔ مجنون اور اس مدہوش کا بھی جس کی عقل زائل ہوگئی ہو یہی حکم ہے (یعنی ان کا ارتداد ارتداد نہ ہوگا اور اسلام اسلام نہ ہوگا)۔

بَابُ الْبُغَاةِ

باغیوں کا بیان

مسئلہ : اگر مسلمانوں کی ایک جماعة کسی علاقے پر غالب آ جائے اور وہ امام کی اطاعت سے نکل جائیں تو امام انہیں پھر جماعة مسلمین کے ساتھ مل جانے کو کہے اور ان کے تمام شبہات زائل کرے ، کیونکہ حضرت علیؓ نے جنگ شروع کرنے سے پہلے حروراء والوں سے ایسے ہی کیا تھا . بلکہ جماعة کے ساتھ مل جانے کی دعوۃ دینا بہ نسبت جنگ کے آسان کام ہے ، اور ممکن ہے کہ افہام و تفہیم سے فتنے کا دروازہ بند ہو جائے لہذا دعوۃ سے ابتداء کرے .

جب تک باغی جنگ میں پہل نہ کریں امام جنگ کی ابتداء نہ کرے . اگر وہ خود جنگ چھیڑ دیں تو امام جنگ کا جواب دے حتی کہ ان کی جمعیة بکھر کر رہ جائے . مصنف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام قدوریؒ نے اپنی مختصر میں اسی طرح ذکر کیا ہے اور ہمارے امام معروف بخواہر زادہ نے فرمایا ہے کہ باغی اگر باقاعدہ لشکر کی صورة میں اجتماع کر لیں تو ان سے جنگ کی ابتداء کی جا سکتی ہے .

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جب تک وہ حقیقۃً جنگ شروع نہ کر دیں امام جنگ کی ابتداء نہ کرے۔ کیونکہ مسلمان سے قتال کرنا اسی وقت جائز ہے جب ان کا شر دفع کرنا مقصود ہو، اور یہ باغی تو مسلمان ہیں، بخلاف کافر کے کہ امام شافعیؒ کے نزدیک نفس کفر ہی سے اباحۃ قتل کا جواز ملتا ہے۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ حکم کا دار و مدار دلیل پر ہوگا، اور دلیل موجود ہے کہ وہ باقاعدہ طور پر جمع ہوگئے ہیں اور اطاعت امام کا ذمہ چھوڑ چکے ہیں۔ کیونکہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ امام تو بیٹھا حقیقی قتال کا انتظار کر رہا ہے اور وہ اس قدر طاقت مجتمع کر چکے ہیں کہ امام کے لیے بچاؤ کرنا مشکل ہو جائے۔ لہذا شرارت و فتنہ کی راہیں مسدود کرنے کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ حکم کا مدار دلیل پر ہو۔

جب امام کو یہ خبر ملے کہ باغی اسلحہ خرید رہے ہیں اور قتال کے لیے تیاری کر رہے ہیں تو مناسب ہے کہ انہیں گرفتار کر لے اور انہیں قید میں ڈال دے تاکہ وہ بغاوۃ سے باز آ جائیں اور سچے دل سے توبہ کر لیں، تاکہ جہاں تک ممکن ہو شر و فساد کو دور کیا جا سکے۔

امام ابو حنیفہؒ سے مروی ہے کہ جب فتنہ برپا ہو تو انسان اپنے گھر میں بیٹھ رہے تو یہ اس حالت پر محمول ہے کہ جب مسلمانوں کا کوئی امام نہ ہو۔ لیکن عادل امام

کی نصرة و اعانة تو قدرة اور استطاعة کے مطابق ہمارے نزدیک اہم واجبات سے ہے۔

مسئله : اگر باغیوں کی کوئی مددگار جماعة ہو تو ان کے مجروحین کو قتل کر دیا جائے اور ان کے فرار اختیار کرنے والوں کا تعاقب کیا جائے۔ تاکہ شر و فساد دو روکا جا سکے ۔ ورنہ وہ پھر باغیوں سے آ ملیں گے اور فساد میں شدة پیدا کریں گے ۔

مسئله : اگر باغیوں کے ساتھ کوئی دوسری جماعة نہ ہو ، تو ان مجروحین کو نہ قتل کیا جائے اور نہ ان کے بھاگنے والوں کا تعاقب ، کیونکہ اس کے بغیر دفع شر کا مقصد حاصل ہو گیا ۔

امام شافعی رح فرماتے ہیں کہ مجروحین کا قتل اور فرار کرنے والوں کا تعاقب دونوں صورتوں میں جائز نہ ہوگا ۔ کیونکہ جب انہوں نے قتال چھوڑ دیا تو اب ان کا قتل دفع شر کے لیے نہ ہوگا ۔ اس کا جواب ہم ذکر کر چکے ہیں کہ اعتبار دلیل کا ہے نہ کہ حقیقة قتال کا ۔

مسئله : نہ تو ان کے بال بچوں کو غلام بنایا جائے گا اور نہ ان کے مال تقسیم کیے جائیں گے ، جیسا کہ حضرت علی رض نے جنگ جمل میں فرمایا تھا کہ نہ تو کسی قیدی کو قتل کیا جائے اور نہ کسی کی پردہ دری کی جائے اور نہ کسی کا مال لیا جائے اور حضرت علی رض کا یہ ارشاد اس بارے میں بہترین نمونہ ہے ۔ قیدی کے بارے میں حضرت علی رض کے

قول کی توجیہ یہ ہے کہ یہ حکم اس صورۃ میں ہے جب کہ باغیوں کی منظم جماعۃ نہ ہو۔ اور اگر وہ منظم جماعۃ کی صورۃ میں ہوں تو امام کو اختیار ہے کہ قیدی کو قتل کرے یا قید کر دے جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ باغی بھی مسلمان ہیں اور اسلام جان و مال کی حفاظۃ کرتا ہے۔

اور اگر مسلمان انہیں کے ہتھیار لے کر ان سے جنگ کریں تو کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ مسلمانوں کو ان ہتھیاروں کی ضرورۃ ہو۔ امام شافعیؒ عدم جواز کے قائل ہیں۔ گھوڑوں اور اونٹوں کے درمیان بھی یہی اختلاف ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ تو مسلمان کا مال ہے اور مسلمان کے مال سے اس کی رضاء کے بغیر انتفاع جائز نہیں ہوتا۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے بصرہ میں ہتھیاروں کو اپنے لشکر میں تقسیم فرما دیا اور یہ تقسیم ضرورۃ کے تحت تھی، ان کی ملک میں دینے کے لیے نہیں تھی۔

دوسری بات یہ ہے کہ شدید ضرورۃ کے وقت امام اہل عدل کے مال میں بھی یہ تصرف کر سکتا ہے، تو باغیوں کے مال میں تو بدرجۂ اولی جائز ہوگا۔ اور اس کا راز یہ ہے کہ بڑے ضرر کو دور کرنے کے لیے چھوٹے ضرر کو اختیار کرنا جائز ہوتا ہے۔

مسئلہ: امام ان کے اموال قابو کرے اور انہیں واپس نہ دے اور نہ مسلمانوں ہی میں تقسیم کرے۔ جب وہ صدق

دل سے تائب ہو جائیں تو ان کے اموال انہیں لوٹا دے۔ تقسیم نہ کرنے کی وجہ تو ہم بیان کر چکے ہیں اور مال کو قابو میں لانے کا مقصد یہ ہے کہ ان کی طاقة کو کمزور کرکے ان کے شر کو دفع کیا جا سکے، اس لیے مال انہیں نہیں دیا جاتا اگرچہ امام کو اس کی احتیاج بھی نہ ہو۔ البتہ ان کے گھوڑے وغیرہ فروخت کر دے اور قیمت محفوظ کر لے کیونکہ قیمة کا محفوظ رکھنا مناسب اور آسان ہے۔

اور ان کے توبہ کرنے کے بعد واپس کر دینا اس لیے ہے کہ ضرورة ختم ہو چکی ہے اور یہ مال غنیمة تو ہے نہیں (کہ انہیں واپس نہ کیا جائے)۔

مسئلہ : اور باغیوں نے جن علاقوں پر غلبہ کرکے ان لوگوں سے خراج یا عشر وصول کر لیا ہے امام ان لوگوں سے دوبارہ نہ لے گا، کیونکہ جزیہ یا عشر کی وصولی حمایة و حفاظة کی بناء پر کی جاتی ہے اور امام ان کی حفاظة سے قاصر رہا۔

اگر ان باغیوں نے جزیہ و خراج کو صحیح مصرف پر خرچ کیا تو جن سے لیا گیا ہے ان کو کافی ہوگا، کیونکہ حق مستحق تک پہنچ چکا ہے۔ اگر باغیوں نے صحیح مصرف پر خرچ نہ کیا ہو تو جن لوگوں سے لیا گیا ہے ان پر فیما بینهم وبین الله دیانة کے طور پر ضروری ہوگا کہ دوبارہ مستحقین کو ادا کریں کیونکہ پہلی ادا کردہ رقم مستحقین کو نہیں پہنچی۔

مصنف علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ہمارے مشایخ کا کہنا ہے کہ خراج کی ادائیگی دوبارہ لازم نہ ہوگی (کیونکہ خراج قتال کے کاموں میں صرف ہوتا ہے)، اور باغی بھی اہل قتال ہیں لہذا خراج صحیح مصرف میں خرچ ہوا .

اگرچہ وہ غنی ہی ہوں اور عُشر کے بارے میں یہ حکم ہے کہ اگر باغی غریب ہوں تو درست ہے کیونکہ عُشر بھی فقراء کا حق ہے . یہ مسئلہ کتاب الزکاۃ میں بیان کر دیا گیا اور امام ان سے آیندہ سال وصول کرے ، کیونکہ اس اثناء میں وہ ان کی حفاظۃ کے فرائض سر انجام دے گا . باغیوں کے شکست کھا جانے سے امام کی حکومۃ متحقق ہوگئی ہے .

مسئلہ : اگر باغیوں کے لشکر میں کسی نے دوسرے کو قتل کر دیا پھر اس لشکر پر غلبہ پا لیا گیا تو ان پر کچھ واجب نہ ہوگا ، کیونکہ قتل کے وقت ان پر امام عادل کی ولایۃ نہ تھی تو یہ قتل موجب قصاص یا دیۃ نہ ہوگا . جیسے کہ دارالحرب میں قتل کیا جائے. (اگر وہاں کوئی شخص دوسرے کو قتل کرکے دارالاسلام میں آ جائے تو اس پر دیۃ و قصاص کچھ نہ ہوگا) .

مسئلہ : اگر باغی کسی شہر پر غالب آ جائیں تو اس شہر کے ایک شخص نے دوسرے شہری کو عمداً قتل کر دیا پھر شہر پر امام نے غلبہ حاصل کر لیا . تو قاتل سے قصاص لیا جائے گا اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ حکم اس صورۃ میں

ہے جب کہ شہر میں باغیوں کے احکامات کا اجراء نہ ہوا ہو، بلکہ اس سے قبل ہی باغیوں کو وہاں سے ہٹا دیا جائے. کیونکہ اس صورة میں امام کی ولایة منقطع نہیں ہوتی بس قصاص واجب ہوگ.

مسئلہ: اگر اہل عدل سے کسی شخص نے باغی مورث کو قتل کر دیا تو قاتل باغی مورث کا وارث ہوگا. لیکن اگر باغی اہل عدل مورث کو قتل کر دے اور کہے کہ میں اس وقت بھی حق پر تھا اور اب بھی حق پر ہوں تو مقتول کا وارث ہوگا. اور اگر یوں کہا کہ جب میں نے اسے قتل کیا تو مجھے معلوم تھا کہ میں باطل پر ہوں تو مقتول کا وارث نہ ہوگ. یہ امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کی رائے ہے.

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ باغی دونوں صورتوں میں وارث نہ ہوگ. اور امام شافعیؒ کا بھی یہی قول ہے. اس کا اختلاف اصل یہ ہے کہ عادل جب باغی کی جان یا اس کا مال تلف کر دے تو نہ اس پر ضمان ہوگی اور نہ اسے گناہ ہوگا، کیونکہ اسے تو ان کا شر دور کرنے کے لیے لڑنے کا حکم ہے. اور باغی جب عادل کو قتل کر دے تو ہمارے نزدیک ضمان نہیں ہوتی اور وہ گناہگار ہوتا ہے. امام شافعیؒ کا سابقہ قول یہ تھا کہ ضمان واجب ہے. اور یہی اختلاف اس صورة میں بھی ہے کہ جب ایک مرتد توبہ کرے اور اس نے توبہ سے پہلے کسی کی جان یا مال تلف کی ہو (ہمارے

نزدیک ضمان نہ ہوگی اور امام شافعیؒ کے قدیم قول کے مطابق واجب ہوگی) .

امام شافعیؒ کی دلیل یہ ہے کہ باغی نے مالِ محترم یا نفس معصوم کو تلف کیا ہے ، تو ضمان واجب ہوگی جیسے منعۃ سے قبل قتل کرنے سے واجب ہوتی ہے .

ہماری دلیل صحابہ کرام کا اجماع ہے جسے امام زہریؒ نے روایۃ کیا ہے . دوسری بات یہ ہے کہ اس نے تأویل فاسد کی بناء پر اتلاف کیا ہے اور فاسد تأویل بھی صحیح تأویل کے ساتھ لاحق ہو جاتی ہے ، بشرطیکہ تأویل فاسد کرنے والوں کو شوکۃ و منعۃ حاصل ہو ، جیسے کہ حربی کافروں کو منعۃ حاصل ہو اور وہ بھی تأویل کریں (تو اس کا بھی یہی حکم ہے کہ اگر حربی کافر لڑائی میں مسلمانوں کو قتل کریں یا ان کے مال تلف کریں اور پھر اسلام لے آئیں تو ان پر نفس یا مال کی ضمان نہ ہوگی) .

اور اس کی (یعنی جب باغی عادل کو قتل کرے تو اس پر ضمان نہ ہوگی اورگناہگار ہوگا) وجہ یہ ہے کہ احکام شرعیہ میں الزام و التزام ضروری ہوتا ہے (یعنی حاکم رعایا پر احکام لازم کرے یا لوگ خود بخوشی اپنے اوپر لازم کریں) ، مگر باغی کی طرف سے التزام نہیں پایا جاتا . کیونکہ وہ اپنی تأویل کی بناء پر اہل عدل کی جان و مال مباح جانتا ہے اور نہ امام ہی باغیوں پر احکام لازم کرسکتا ہے کیونکہ امام کو ان پر اختیار حاصل نہیں ہے . انہیں تو

اپنی مدافعة اور مقابلے کی طاقتِ حاصل ہے اور جب تک ان میں مدافعة کی قوة نہ تھی امام کو ان پر ولایة حاصل تھی. اور جب باغی نے تأویل سے کام نہ لیا ہو تو اعتقاد کے لحاظ سے التزام ثابت ہے ، (کہ وہ باغی اپنے اعتقاد کے مطابق بھی قتل نفس یا اخذ مال کو ممنوع جانتا ہے) ، بخلاف گناہ کے (وہ تو ہر صورة میں لازم ہے) کیونکہ حق شرع میں منفعة و شوکة کا کچھ اعتبار نہیں ہوتا .

جب یہ ثابت ہوگیا تو ہم کہتے ہیں کہ عادل کا باغی کو قتل کرنا برحق قتل ہے . لہذا عادل اس کی میراث سے محروم نہ ہوگا . باغی کے عادل کو قتل کرنے کی صورة میں امام ابو یوسفؒ کا کہنا ہے کہ تأویل فاسد کا اعتبار صرف ضمان کے ازالے کے لیے ہوتا ہے اور یہاں حاجة میراث کے استحقاق کی ہے ، تو میراث کے حق میں تأویل فاسد کا اعتبار نہ کیا جائے گا . (لہذا باغی عادل مقتول کے ورثے سے محروم ہوگا) .

امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کہتے ہیں کہ مذکورہ صورة میں وراثة کی محرومی دور کرنے کی بھی حاجة ہے ، کیونکہ باہمی قرابة وراثة کا سبب ہوا کرتی ہے . لہذا محرومی دور کرنے میں بھی تأویل فاسد کا اعتبار کیا جائے گا . البتہ اس میں شرط یہ ہے کہ وہ اپنے طور پر اس تأویل کو درست جانتا ہو اور اگر وہ کہے کہ میں باطل پر تھا تو ضمان دور کرنے والی تأویل نہ پائی گئی لہذا ضمان واجب ہوگی .

مسئلہ : اہل فتنہ کے ہاتھ اور ان کے لشکر میں اسلحہ کی فروخت مکروہ ہے، کیونکہ یہ تعاون علی الإثم ہے۔ اور کوفہ میں اہل کوفہ کے ہاتھ اور اہل فتنہ میں سے جسے جانتا ہی نہ ہو اس کے پاس ہتھیار فروخت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ شہروں میں عموماً نیک اور صالح لوگ ہوتے ہیں۔ اور مکروہ تو نفس اسلحہ کی فروخت ہے اور اس چیز کا فروخت کرنا مکروہ نہیں جس کو بغیر صنعة اور کاریگری کے ہتھیاروں میں تبدیل نہ کیا جا سکتا ہو، (جیسے لوہا اور فولاد وغیرہ) کیا آپ دیکھتے نہیں کہ گانے بجانے کے آلات کی خرید و فروخت ممنوع ہے؟ مگر اس لکڑی کی خرید و فروخت ممنوع نہیں (جس سے آلات طرب بنائے جاتے ہیں)۔ یہی حکم شراب کا انگور کے ساتھ ہے (کہ شراب کی خرید و فروخت ممنوع ہے مگر انگور کی جائز ہے)۔